دیوانِ بقا

ذخیرۂ اشپرنگر

مع مقدمہ

از

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

صدرِ شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی

سلسلۂ اشاعتِ مخطوطاتِ اُردو

دیوانِ بقا

شائع کردۂ شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی

قیمت ساڑھے تین روپے

ڈیونین پرنٹنگ پریس دہلی،

فہرست عنوانات دیوانِ بقا

مقدمہ

میر کی ہجو میں بقا کے یہ دو شعر بہت مشہور ہیں :

میر نے تو ترا مضمون دوآبے کا لیا   پر بقا تو یہ دعا کر جو دعا دینی ہو
یا خدا میر کے دیدوں کو دوآبہ کر دے   اور بینی یہ بہا اس کی کہ تر بینی ہو[1]

بقا صرف میر ہی کے حریف نہیں، سودا کے بھی تھے۔ اُن کے اِن معرکوں کا ذکر آبِ حیات کے علاوہ تقریباً تمام تذکروں میں درج ہے۔

گارساں دتاسی نے لکھا ہے :

" محمد بقاء اللہ تخلص بقا، حافظ لطف اللہ کے بیٹے تھے۔ ان کی ولادت اکبر آباد (آگرہ) میں ہوئی لیکن نوجوانی میں لکھنؤ آکر رہنے لگے تھے۔ ان کا خط بہت پاکیزہ تھا۔ مشرق کے لوگوں میں اس فن کی مہارت بہت پسند کی جاتی ہے۔ اشعار بھی اچھے کہتے تھے، دہلی میں وہ ابتداءً غمیں تخلص کرتے تھے۔ بعد میں شاہ حاتم کے کہنے پر بقا اختیار کیا۔ وہ حاتم، میر درد اور خصوصیت کے ساتھ میر فاخر مکین کے شاگرد تھے۔ مصحفی سے ان کے گہرے مراسم تھے جن کے پاس وہ دہلی میں اکثر جایا کرتے تھے۔ مصحفی کا بیان ہے کہ وہ خلیق، ظریف اور قانع جوان تھے جیسا کہ مذہبی لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی طبعِ شوخ ہجو کی طرف مائل تھی۔ اسی وجہ سے دہلی میں ان کے

---

[1] دیوانِ بقا قلمی ورق ۴۰ ب۔ ذخیرۂ اشپرنگر۔ نسخہ مطبوعۂ دہلی یونی ورسٹی ص ۷۸

تیر سے اور لکھنؤ میں سودا سے معرکے ہوئے۔ لطف کا بیان ہے کہ بقا کا انتقال کربلائے معلیٰ اور نجفِ اشرف کی زیارت کے دوران میں ہوا۔ یہ سفر انھوں نے ۱۲۰۶ھ (مطابق ۱۷۹۱ء) میں کیا تھا۔ انھوں نے ایک دیوان چھوڑا ہے جو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے۔

فاخر مکین جن کا ذکر اوپر آیا ہے، غرور کی وجہ سے اپنے آپ کو شمالی ہندستان کے معروف شاعر علی حزیں سے بہتر سمجھتے تھے۔ موخر الذکر مسلمانوں میں اپنے زہد کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کی خود نوشت سوانح کا ترجمہ مسٹر بلفور نے کیا ہے۔ فاخر نے حزیں کے اشعار میں اصلاح دینے کی جسارت کی۔ اس پر سودا نے جو ہندوستان کے JUVENAL ہیں ان کی ہجو لکھی[۱]۔"

سعادت خاں ناصر صاحبِ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا نے بقا پر سودا کی اہانت کا الزام لگایا ہے:

شیخ بقاء اللہ تخلص بقا پسر حافظ لطف اللہ خوش نویس اکبر آبادی۔ پیشتر غمیں تخلص قرار دیا تھا۔ جب شاگرد شاہ حاتم کا ہوا، بقا تخلص کیا۔ حاتم کے شاگرد تمام رفیع سودا سے رجوع لائے مگر بقا کہ نام حاتم کا اوتے بقا رہا منکرِ سودا غائب وحاضر بلکہ اہانت سودا کی اوس کے کلام سے ظاہر اور میر تقی تیر سے بھی ناصاف، غلطی کا اوس کی اعتراف ہر دو بزرگوار کی مذمت سے آلودہ اور خامہ صفحۂ ہجو پر فرسودہ رکھتا تھا۔ آخر عمر میں وحشت نے اوس کی طبع پر راہ پائی، دیوان کو اپنے اوسکی مکافات میں کہ بہت سے پردۂ ناموس پارہ کیے تھے کاغذِ مشکوک کی طرح پارہ کیا۔ چند شعر اوس کے کہ احباب کی بیاضوں میں رقم تھے جمع ہوئے۔

---

[۱] گارساں دتاسی: تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی (فرانسیسی) جلد دوم طبع ثانی صفحات ۹۷ و ۹۸۔

حکایت : بعد کم ہونے اوس وحشت کے عازم بیت اللہ کا ہوا، اسباب خانہ مع زمین چار سو روپیہ کو بیچا اور اس کا غلہ خرید کر کے کشتی میں بھر لیا۔[1]

مفتی صدر الدین آزردہ نے اپنے تذکرے میں بقا کا ذکر کیا ہے[2] لیکن اس میں کوئی خاص بات نہیں۔ احمد علی یکتا نے دستور الفصاحت میں اُن کی شان میں بڑی قصیدہ خوانی کی ہے اور لکھا ہے کہ انھوں نے ریختہ کو فارسی کا اوج بخشا :

"ششم از طبقۂ ثانی، تہمتن میدان سخنوری، اسفندیار معرکۂ شاعری، بقاء اللہ خاں بقا است، کہ بقوت صفائی و فصاحت الفاظ، حضیض ریختہ را باوج فارسی رسانده، و بتوانائی بلاغت و متانت کلام، ادہم ہندی را باشہب عربی دوانده۔ شاعر قصیده گو گذشتہ، لہذا بمقابلہ مرزا محمد رفیع، در قصاید جوابش داد معنی یابی و تشابیہ غریبہ داده۔ از متاخرین کسی ہمتراز وے او نبود۔ آخر آخر دماغش مختل گردیده دیوانِ خود را مع ہمہ مسودہاے کلام خود، پاره نموده (۲۰۸ الف) بآب تر کرده، در سبوچۂ کلان میداشت ہر کسے کہ طالب شعرش می آمد، ہماں سبوچہ نشاں داده میگفت کہ " دریں ہمہ کلیات من است۔ ہر چہ منظور باشد، بنویسید۔ اما ہجوہاے بعض کساں کہ کرده ام براے خدا ننویسید کہ من توبہ کرده ام " و چوں آخر شوق زیارت حضرت اباعبداللہ الحسین علیہ السلام دامنگیر شد، و از فرط غیرت، کہ مخمر طینتش بوده، نمی خواست کہ دست سوال پیش کس دراز کند یا اعانت زاد راہ جوید، اراده نموده کہ دو سہ حرفہ خود بیاموزد ؛ تا دراں بقعہ مبارکہ روزی حلال بکسب دست حاصل نموده خورده باشد۔ چنانچہ کندن عقیق و نوشتن خط نستعلیق و نسخ و علم طب درہماں

---

[1] سعادت خاں ناصر : خوش معرکۂ زیبا قلمی۔ مخزونہ لکھنؤ یونی ورسٹی لائبریری ورق ۳۱ ب

[2] تذکرۂ صدر الدین آزرده قلمی ص ۷، کیمبرج۔ عکس مملوکۂ راقم

حالت حاصل نمودہ، از راہ بنگالہ عازم منزل مقصود گردید۔ گویند کہ درہماں ضلع بکدام مکان اجلش در رسید، واز سودای دنیا اور اخلاصی داد۔ باراقم بسیار آشنا بود، وکمال انس داشت۔ حالا قریب دو ہزار شعر از وجہ جستہ پیش مرداں مشہور است[۱]"

مصحفی اور بقا میں گہرے مراسم تھے۔ انھوں نے بھی تذکرۂ ہندی میں ان کی "تلاشِ بسیار" کی تعریف کی ہے:

"بقا، کہ بقاء اللہ نام دارد پدرش حافظ لطف اللہ خوشنویس از اکبر آباد آمدہ بود و خودش در لکھنؤ نشو و نما یافتہ بیشتر غمیں تخلص میکرد و شعر فارسی می گفت واز نظر مرزا فاخر مکین می گزرانید آخر آخر شوق شعر ہندی دامن دلش را فرا گرفتہ، درایامے کہ وارد شاہجہاں آباد بود باشارۂ شاہ حاتم بقا تخلص گذاشتہ حالا نسبت شعر فارسی بسوی خود کمتر می کند وخود را یکے از ریختہ گویاں می پندارد، شاہ مذکور مشار الیہ را بہ ہمیں جہت در سلکِ اسامی شاگردانِ جدید خود نوشتہ و طرفہ اینکہ شیخ مذکور در تذکرۂ فتح علی خاں حسینی تخلص کہ بر بھوجلا پہاڑی قیام دارند بطوع ورغبت خود خود را شاگرد میر درد نویسانیدہ[۲]۔ در غزل وغیرہ تلاش بسیار می کند اما در قصیدہ خیلے ید طولیٰ دارد ہر چہ می گوید بسیار بتلاش وعلو می گوید اما در گفتنِ غزل بطی است۔ بافقیر در رابطۂ آشنائی بسیار مربوط است بلکہ اکثر در شاہجہاں آباد چندے یکجا بودیم و شام و چاشت باتفاق ہم می کردیم۔ غرضکہ جوانِ سراپا خلق و ظریف مزاج و قانع دیدمش۔ طبع شوخش بطرف ہجو بسیار

---

[۱] یکتا: دستور الفصاحت طبع رام پور ص ۸۰ و ۸۱

[۲] سید فتح علی گردیزی: تذکرہ ریختہ گویاں، بقا کے ذکر سے خالی ہے۔ طبع اول ۱۹۳۳ء

مائل افتادہ در شاہجہاں آباد با میر و در لکھنؤ با مرزا معرکہ گیر بہا کردہ وقت طبع خود را ظاہر نمودہ۔ حالا در لکھنؤ بکنج قناعت پا شکستہ اوقات بسری می کند۔ با فقیر گاہ گاہے ملاقات می شود[۱]۔"

بقا کے تعلقات میر حسن سے بھی تھے۔ ان کے ساتھ بھی صحبتیں گرم رہتی تھیں اور وہ بھی اُن کے "خوش فکر و خوش اندیشہ" ہونے کے مقر تھے۔ تذکرۂ شعرائے اُردو میں لکھتے ہیں:

"بقا۔ غنچۂ بوستانِ وفا، سروِ موزونِ باغِ صفا، شیخ بقاء اللہ خاں المتخلص بہ بقا ابنِ حافظ لطف اللہ کہ در لکھنؤ مشہور اند۔ جوانے ست بہ کمالِ خوبی خوش فکر و خوش اندیشہ، در شعرِ فارسی از شاگردانِ میرزا فاخر مکیں سلمہ اللہ تعالیٰ لیکن شوقِ ریختہ نیز دارد۔ با فقیر صحبت ہا گرم داشتہ است خدا سلامت دارد[۲]۔"

میر قدرت اللہ قاسم نے بقا کی گرم گفتاری، شوخ طبعی اور ظریف نہادی کا ذکر کیا ہے۔ مجموعۂ نغز میں لکھتے ہیں:

" بقا تخلص، محمد بقاء اللہ فرزند ارجمند حافظ لطف اللہ خوش نویس اکبر آبادی است۔ شعر فارسی بہ اصلاح مرزا محمد فاخر مکین رسانیدہ و اشعار ریختہ از نظر استاد اکثرے از سخن سنجانِ عالم شیخ ظہور الدین حاتم گزرانیدہ بہر دو زبان اگرچہ گرم گفتار است اما میلش بریختہ گوئی بسیار است۔ رخش شوخ طبعی و ظریف نہادی می پوید بہجو ہر کس بے مہابا (کذا) مبادرۃ می جوید باسر آمد شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودا و سخن سنجِ بے نظیر محمد تقی میر طرف شدہ [تخطیہ نمودہ] ہجو ایشاں پرداختہ سزائے کردار ناہنجار [ایں] عزیزان

۱؎ غلام ہمدانی مصحفی: تذکرۂ ہندی طبعِ دہلی سنہ ۱۹۳۳ء ص ۴۳

۲؎ میر حسن: تذکرۂ شعرائے اردو طبع سنہ ۱۹۴۰ء ص ۳۲

بواجبی در [کنار] نهاده زبان زدِ خاص و عام ساخته که مرزا بهجو ہر کس بے ہیچ خیلے دلیر بوده و از دستِ تیر با ایں ہمہ قابلیت عنان جوہر [قابل ثنا] سی [کبر و] خود سریش در ربوده۔ قصہ مختصر محمد بقاء اللہ اگرچہ گرد مضامین قدما میگردد۔ اما بغایت درست فکر، خوشگو، شیریں گفتار، معانی جو است [۱]"

قاسم کی طرح سرور نے بھی بقا کے کلام کی تعریف کی ہے۔ عمدۂ منتخبہ میں لکھتے ہیں :

"بقا تخلص۔ محمد بقاء اللہ [۲]، خلف حافظ لطف اللہ خوش نویس، شاگرد میرزا محمد فاخر مکین، اصلش از اکبر آباد۔ شعر فارسی و ریختہ ہر دو می گوید۔ لیکن میلان طبعش بہ طرف اشعار ہندی بیشتر است۔ شوخ طبع و ظریف مزاج و بہ ہجوگوئی راغب۔ اکثر با میر و مرزا معارض شده و در اشعارِ ایں ہر دو برگزیده شعرائے ہندوستان سقم بر آورده و ہجوہا گفتہ۔ پختگی کلامش و عذوبت گفتارش از تصانیفش ہویدا است۔ از شیریں کلامی اوست [۳]"

شاہ کمال نے مجمع الانتخاب [۴] میں اور لطف نے گلشن ہند میں بقا کا نام محمد بقا لکھا ہے۔

کریم الدین [۵] نے لطف کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ ۱۲۰۶ھ میں حج کے ارادے

۱۔ قاسم : مجموعۂ نغز۔ جلد اول۔ طبع لاہور ص ۱۰۷

۲۔ خوب چند ذکا نے محمد بقاء اللہ خاں نام لکھا ہے۔ (عیار الشعرا قلمی ورق ۳۱ الف)

۳۔ میر محمد خاں سرور : عمدۂ منتخبہ شایع کردۂ شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی ص ۱۲۷

۴۔ شاہ محمد کمال : مجمع الانتخاب قلمی ورق ۱۰۰ ب

۵۔ تذکرہ کریم الدین۔ مطبوعہ دہلی ص ۲۰۰، نیز شاہ محمد کمال ورق ۱۰۰ ب

سے حجاز کی طرف گئے تھے۔ یہ قول صحیح نقل نہیں ہوا۔ لطف کا بیان یہ ہے:

"بقاؔ تخلص، محمد بقا نام، بیٹا حافظ لطف اللہ کا شاگردوں میں سے میرزا فاخر مکینؔ تخلص کے تھا۔ فی الحقیقت عزیز نکتہ سنج و باریک بین و معنی بند و سخن آفریں تھا۔ میرزا رفیع سوداؔ تخلص کے منہ اکثر چڑھا اور اس نہنگ بحر معانی کی ہجو میں کچھ کچھ واہیات مکرر بکا، لیکن میرزائے مرحوم نے مطلق اعتنا نہ کی اور یہ بات کہی کہ میں نے جس کی ہجو کی، نام اس کا اسی تقریب سے تمام عالم میں ہوا مشہور ہے۔ سو تیری ہجو نہ کروں گا کہ تیرا مشہور کرنا مجھے نہیں منظور ہے۔ غرض اس عزیز سے زمانے نے موافقت کبھی نہ کی اور صورت روزگار کی بیچارے نے آئینے میں خیال کے بھی نہ دیکھی۔ افلاس سے تنگ آکر کسی کے کہے سے کچھ اعمال تسخیر کواکب شروع کیے تھے۔ خیال میں اس سودائے خام کے مجنوں ہوئے اور جب تک جیے سودائی رہے۔ سنہ ۱۲۰۶ھ بارہ سو چھ ہجری تھی کہ حالت میں سودائی کے یہ بات سوجھی کہ تحصیل دولت عقبیٰ کیجیے اور خاکِ راہ سے کربلا معلّا اور نجف اشرف کی دیدۂ دل میں سرمۂ حق نما دیجیے۔ یہ عزم کرکے جہاز پر سوار ہوئے اور منزل مقصود کی طرف قدم گزار ہوئے۔ اثنائے راہ میں اس دارِ فانی سے، موافق نام اپنے کے، سفر ملک بقا کا کیا۔[۱]"

کریم الدین نے بقاؔ کا شمار طبقۂ دوم کے شعرا میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ حاتمؔ، دردؔ اور مکینؔ کے شاگرد تھے:

"اول اوس نے تخلص غمیںؔ رکھا بعد ازاں دہلی میں آکر بقاؔ تخلص اختیار کیا۔ یہ تخلص بہ سبب فرمانے شاہ حاتمؔ کے جو کہ اوس کا استاد تھا بدلا تھا۔ خواجہ میر دردؔ

---

[۱] لطف: گلشنِ ہند طبع ۱۹۰۶ء ص ۷۰ و ۷۱

سے بھی اس نے اصلاح لی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ لطف کہتا ہے کہ بقا بارادۂ حج درمیان ۱۲۰۶ھ کے جانب حجاز کے گیا تھا۔ اسی سال میں درمیان راہ کے وارِ بقا کو پہنچا ہے[1]

شیفتہ نے بھی لکھا ہے کہ بقا، درد کے شاگرد تھے۔ گلشنِ بیخار میں انھوں نے بقا کے طرزِ" بامزہ وشیریں" کی تعریف کی ہے:

" بقا۔ تخلص شیخ محمد بقاءاللہ خلف حافظ لطف اللہ خوشنویس اصلش از اکبرآباد ومنشاءآن لکھنؤ۔ خاطر ظرافت پسند داشت۔ بل از ظرافت درگزشتہ سر بہ ہجا کشیدہ۔ بشریک دورہ میر وسودا و با انیان بیشتر طرف شدہ وہجوہا گفتہ و در مراتب نظم طبعے شگفتہ ورنگین وطرزے بامزہ وشیریں داشتہ کمتر ک بقند پارسی ہم کام وزبان را حلاوت آگیں می نمودہ بپارسی شاگرد مرزا فاخر مکین ودر ریختہ از تلامذۂ شاہ حاتم وخواجہ میر درد غفر اللہ لہما نوشتہ اند "[2]

ڈاکٹر اشپرنگر نے لکھا ہے:

"بقا۔ شیخ محمد بقاءاللہ خاں ولد خوشنویس حافظ لطف اللہ خاں، ساکن آگرہ، یہ لکھنؤ میں رہتے ہیں اور مکین کے شاگرد ہیں (تذکرۂ علی ابراہیم) پہلے ان کا تخلص غمیں تھا؛ اور فارسی میں بھی نظمیں کہا کرتے تھے۔ مصحفی ان کے دوست تھے؛ اور ان کے بیان کے مطابق یہ ۱۲۰۹ھ میں زندہ تھے، اور لکھنؤ میں رہا کرتے تھے۔ عشقی بھی کہتے ہیں کہ جب انھوں نے اپنا تذکرہ لکھا تو یہ زندہ تھے۔ لیکن صاحب گلشن ہند کے خیال میں انھوں نے ۱۲۰۶ھ میں انتقال کیا۔"[3]

---

[1] تذکرۂ کریم الدین۔ نسخہ قدیمہ مطبوعہ دہلی ص ۲۰۰

[2] شیفتہ: گلشنِ بے خار نول کشور ص ۳۳

[3] اشپرنگر: یادگارِ شعرا مترجمۂ طفیل احمد ص ۳۹

عشقی نے ان کو "ادام اللہ بقاءہ" لکھا ہے اور نام محمد بقا:

"بقا تخلص، دہلوی اسمش شیخ محمد بقا ادام اللہ بقاءہ۔ مردے مستعد و خوشگو۔ از یاران میر غلام حسن، حسن تخلص است، مشق فارسی باستصلاح مرزا فاخر مکین می نماید و درطرز ریختہ نیز داد فصاحت و بلاغت می دہد۔ غرض کہ بالفعل در شہر لکھنؤ بزمرۂ معاصرین ہنگامہ سخنوری گرم دارد"[1]

منولال نے گلدستۂ نشاط میں بقا کا ایک شعر نقل کیا ہے:

ماہِ نو، انجم کے عقدے کس طرح سے وا کرے
ہوں جہاں لاکھوں گرہ واں ایک ناخن کیا کرے[2]

عشقی[3] اور لطف[4] نے بقا کا نام محمد بقا اور منولال نے میر بقا خاں[5] لکھا ہے۔ محمد حسین آزاد نے بقا کا نام وہی لکھا ہے جو عشقی نے اور ان کو فارسی میں مرزا فاخر مکین اور اردو میں شاہ حاتم کا شاگرد قرار دیا ہے۔ آب حیات کی رو سے ان کا مولد دہلی اور اکبرآباد وطن تھا۔ وہ لکھنؤ میں جا بسے تھے اور میر و سودا دونوں

---

[1] عشقی: بحوالہ دو تذکرے مطبوعہ پٹنہ ص ۹۲

[2] منولال: گلدستہ نشاط: مطبوعہ کلکتہ ۱۸۳۶ء ص ۳۹۶

[3] عشقی (پٹنہ) ص ۹۲

[4] لطف: گلشن ہند۔ ص ۷۰

[5] منولال: گلدستہ نشاط ۱۸۳۶ء ص ۳۹۶

کو خاطر میں نہ لاتے تھے[1]۔

یکتا[2] اور لطف[3] دونوں کا یہ بیان ہے کہ بقا کو جنون ہی کی حالت میں کربلائے معلیٰ اور نجفِ اشرف کی زیارت کا شوق ہوا لیکن اثنائے راہ میں انتقال کیا۔ لطف نے اس سفر کی تاریخ سنہ ۱۲۰۶ھ دی ہے اور یہی ان کی رحلت کی تاریخ ہے لیکن تذکرۂ روزِ روشن میں ہے کہ "تا سال بستم از مائۃ سیزدہم در قید حیات بود"۔

بقا صفِ اول کے شعرا میں نہیں ہیں۔ میر و سودا کے آگے ان کا چراغ نہ جل سکا۔ اپنا لوہا منوانے کے لیے انھوں نے ان استادوں کے رنگ میں کہنے کی کوشش کی لیکن جب ان کی ہم سری نصیب نہ ہو سکی تو ان کی ہجویں کہیں اور اپنے دل کا بخار خوب نکالا۔ بقا اس نکتے کو نہیں سمجھے کہ میر کے فکر و فن میں جو وحدت ہے ان کے لب و لہجے میں جو بلند سنجیدگی اور ماورائی سادگی ہے وہ "زورِ بازو" سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح سودا کی عظمت کا راز صرف یہ نہیں ہے کہ انھوں نے سنگلاخ زمینوں کو پانی کر دیا ہے بلکہ ان کی بڑائی، ان کی دیدہ وری، ان کے تنقیدی شعور اور سماجی احساس میں پوشیدہ ہے۔ بقا نے سودا کی ریس میں مشکل زمینوں میں شعر کہے (بقول اُن کے "رشکِ غزل سودا") لیکن بعض مہمل ہو کر رہ گئے اور ان کے عالمِ خیال کا مدعا عنقا ہی رہا۔ بقا نے پردے کے نقش و نگار کو حقیقت باور کر لیا۔ اس کے پیچھے جو معنی کا جلوہ ہے اسے نہیں دیکھا۔ اُن کی اِس قسم کی غزلیں محض لفظی بازی گری کا نمونہ ہیں:

---

[1] آزاد: آبِ حیات طبعِ لاہور ص ۱۵۴۔ حاشیہ۔

[2] یکتا ص ۸۰ و ۸۱

[3] لطف ص ۷۰ و ۷۱

ع قاتل جو ملے مجھ سے کفن نذر پکڑ کر

ع جو چشم و دل سے چڑھا دوں نالے، بہ آب اول دوم بہ آتش

ع کرکے با تابِ نگہ یاں تن وآتش کو بہم

ع میری گو آہ سے جنگل نہ جلے، خشک تو ہو

اور اس بات کو بھی ظاہر کرتی ہیں کہ وہ اسلوب جو انشاؔ، ناسخؔ اور نصیرؔ سے منسوب کیا جاتا ہے، اس کا پہلا نقش سوداؔ اور بقاؔ ہی کی بدولت صورت پذیر ہوا۔

بقاؔ میرؔ کے زمانے میں شعر کہہ رہے تھے جو خدائے سخن ہیں۔ وہ سوداؔ کے زمانے میں سخنوری کر رہے تھے جو طنز کے بادشاہ اور قصیدے میں انوری وخاقانی کے ہم رتبہ ہیں۔ ان استادوں کے آفتابِ کمال کے سامنے معمولی تاروں کا بے نور ہو جانا حیرت انگیز نہیں۔ حیرت انگیز ان کے بعض غزلیہ اشعار ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

عشق میں بُو ہے کبریائی کی   عاشقی جس نے کی، خدائی کی

ہمسری مت صبا سے کر اے آہ   تو نے بھی کچھ گرہ کشائی کی

لے چلے ہم قفس سے اے صیّاد   خاک میں آرزو رہائی کی

روزِ محشر تلک نہ آخر ہوں   داستانیں شبِ جدائی کی

راستی پر ہم سے کس دن آئیاں   یار کی زلفیں جو ہیں بل کھائیاں

مرحبا رو رو کے اے ابرِ مژہ   روز ساون کی رتیں دکھلائیاں

جل کے خاکستر ہوا غم سے بقاؔ   اے میاں اتنی بھی بے پروائیاں

دیکھ آئینہ جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں   اس کا میں دیکھنے والا ہوں بقاؔ، واہ رے میں

غیر بر وضع ہیں، محفل سے شتاب ان کی اُٹھو
پاس ایسوں کے تم اے جان بھلے بیٹھ گئے
ناتواں ہم ہوئے یاں تک کہ تری محفل تک
گھر سے آتے ہوئے سو بار چلے بیٹھ گئے

ہاں میاں سچ ہے تمھاری تو بلا ہی جانے
جو گزرتی ہے مرے دل پہ خدا ہی جانے
دل کی واشد پہ عبث آہ نے کھینچی تکلیف
کھولنے عقدے تو غنچوں کے صبا ہی جانے
ہم تو نت دور سے خمیازہ کشِ حسرت ہیں
لذتِ بوس و کنار اس کی حیا ہی جانے
تیرے بیمار کو کیا ہوئے شفا جس کے طبیب
نہ تو کچھ درد کو سمجھے، نہ دوا ہی جانے
طور پر اپنے سخن کون برا کہتا ہے
پر یہ انداز جو پوچھو تو بقاؔ ہی جانے

ان غزلوں سے بھی زیادہ حیرت انگیز بقاؔ کے قصائد ہیں جو الفاظ کی شوکت تشبیہات کی لطافت اور تراکیب کی خوش نمائی سے خالی نہیں ہیں۔ یہاں سوداؔ کے رخِ روشن کے آگے شمع رکھنا یا بقاؔ کا ان سے مقابلہ کرنا غلط ہوگا مگر جو قصیدے اس مختصر سے مجلّد میں شامل ہیں وہ شان و شوکت اور متانت و جزالت میں بلند پایہ نہ سہی لیکن پڑھنے کے قابل ضرور ہیں۔ خاص طور پر ان دو قصیدوں میں تو انھوں نے شاندار الفاظ اور باوقار تشبیہات کا انبار لگا دیا ہے:

۱۔ جب مری چشم گئی نیند سے کل رات جھپک۔

۲۔ کل حضرتِ بقاؔ سے کیا میں نے یہ سوال

بقاؔ کی ہجویات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ وہ میرؔ و سوداؔ دونوں کی شاعری کے منکر تھے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

کھول دیوان دونوں صاحب کے
اے بقاؔ ہم نے جب زیارت کی
شعر سوداؔ و میرؔ کے دیکھے
وہ "تو تو" کریں ہیں" یہ "ہی ہی"

دیوانِ بقاؔ ص ۸۰

آزاد نے لکھا ہے کہ سودا اور مرزا فاخر کے معرکے میں بقاءاللہ خاں بقا درمیان میں پڑے کہ زبانی پیاموں سے عبرت الغافلین کے داغوں کو دھوئیں جس میں سودا نے مرزا فاخر کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کو ظاہر کیا تھا۔ فاخر کا ایک شعر ہے ؎

گرفتہ بود دریں بزم چوں قدح دلِ من | شگفتہ روئے صہبا شگفتہ کرد مرا

سودا کو اعتراض تھا کہ قدح کو گرفتہ دل کہنا بے جا ہے۔ اہلِ انشا نے ہمیشہ قدح کو کھلے پھول سے تشبیہہ دی ہے یا ہنسی سے۔ آزاد لکھتے ہیں:" بقا نے جواب میں شاگردی کا پسینا بہت بہایا اور اخیر کو باذل کا ایک شعر بھی سند میں لائے ؎

چہ نشاط بادہ بخشد بمنِ خراب بے تو | بہ دلِ گرفتہ ماند قدحِ شراب بے تو

مرزا رفیع سن کر بہت ہنسے اور کہا کہ اپنے استاد سے کہنا کہ استادوں کے شعروں کو دیکھا کرو تو سمجھا بھی کرو۔ یہ شعر تو میرے اعتراض کی تائید کرتا ہے۔ یعنی باوجودیکہ پیالہ ہنسی اور شگفتگی میں ضرب المثل ہے اور پیالۂ شراب سامانِ نشاط ہے مگر وہ بھی دلِ افسردہ کا حکم رکھتا ہے[1]"

آزاد نے میر و بقا کے معرکے بھی بیان کیے ہیں اور میر کے ترجمے میں بقا کے یہ دو شعر نقل کیے ہیں:

اِن آنکھوں کا نت گریہ دستور ہے | دوآبہ جہاں میں یہ مشہور ہے

سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے میں | ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دوآبے میں

اس پر آزاد لکھتے ہیں کہ میر صاحب نے خدا جانے سُن کر کہا یا توارد ہوا:

وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
سوکھا پڑا ہے اب تو مدّت سے یہ دوآبہ

---

[1] آبِ حیات طبع لاہور ص ۲۲۰

اس پر بقاؔ نے جو قطعہ کہا تھا وہ اوپر نقل ہو چکا ہے۔

آزادؔ نے بقاؔ کے چند اور شعر بھی نقل کیے ہیں۔ جن میں میرؔ پر کھلی چوٹیں ہیں[1]

میر صاحب پھر اس سے کیا بہتر | اس میں ہووے جو نام شاعر کا
لے کے دیواں پکارتے پھریے | ہر گلی کوچہ "کام شاعر کا"

توبہ زاہد کی توبہ تلّی ہے | چلے بیٹھے تو شیخ چلّی ہے
پگڑی اپنی سنبھالیے گا میرؔ | اور بستی نہیں یہ دلّی ہے

بقاؔ نے میرؔ پر سرقے کا الزام لگایا ہے۔ ان کے یہاں جو "کثرتِ یک لفظ"[2] ہے، اس کا مذاق اُڑایا ہے، ان کی سیادت[3] پر اعتراض کیا ہے، ان کی خوے زشت[4] اور طبعِ عجیب کو لایقِ ملامت ٹھہرایا ہے۔ لیکن بقاؔ کی ہجویات کے ہدف میرؔ ہی نہیں، سوداؔ بھی تھے اور بعض جگہ انھوں نے دونوں کو لپیٹ میں لے لیا ہے[5]:

مرزا و میرؔ باہم دونوں تھے نیم مُلّا | فنِ سخن میں یعنی ہر ایک تھا ادھورا
اس واسطے بقاؔ اب ہجوؤں کی ریسماں سے | دونوں کو باندھ باہم میں نے کیا ہے پورا

---

[1] آبِ حیات ص ۲۲۰ کلیاتِ بقا ص ۷۵ تا ۸۰
[2] دیوانِ بقا ص ۷۵ ; ۷۸
[3] ایضاً ص ۷۹
[4] ایضاً ص ۷۹
[5] ایضا ص ۷۶

طرفہ لطیفہ ہے کہ کلیاتِ سودا میں بقا کے خلاف کوئی ہجو نہیں ہے۔ اس خاموشی سے غالباً ان کا مقصد یہ تھا کہ بقا کو اہمیت نہ دی جائے۔ لطف نے سودا کا ایک قول بھی نقل کیا ہے:

"میں نے جس کی ہجو کی، نام اس کا اسی تقریب سے تمام عالم میں ہوا مشہور ہے۔ سو تیری ہجو نہ کروں گا کہ تیرا مشہور کرنا مجھے نہیں منظور ہے۔"[1]

بقا کی ہجویات میں وہ وسعت نہیں ہے جو سودا کے یہاں ہے۔ بقا نہ معاشرے کی خرابیوں پر انگشت نمائی کرتے ہیں، نہ حکومت کے زوال و انحطاط کی کہانی سناتے ہیں۔ ان کا دائرۂ فکر تنگ ہے۔ ان کی ہجویات شخصی ہیں اور ذاتی اختلافات کا نتیجہ ہیں لیکن وہ تخئیلی اور تخلیقی ظرافت کے عناصر سے عاری نہیں ہیں اور ان کا مطالعہ میر اور عہدِ میر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

یکتا کا بیان ہے کہ بقا کے دو ہزار اشعار لوگوں میں مشہور ہیں۔ علی ابراہیم خاں (اور لطف) نے جو اشعار دیے ہیں، وہ بھی وہ ہیں جو ان کے گوشۂ خاطر میں محفوظ تھے۔ آخر میں تو وفورِ دیوانگی میں یہ حال ہو گیا تھا کہ اپنے کلام کو پارہ پارہ کر کے اور ایک ہبوچے میں پانی ڈال کے رکھ لیا تھا اور جو طالبِ شعر آتا، اس سے کہتے اس میں میرا پورا کلیات ہے، جو چاہے لکھ لو لیکن خدارا ہجویات نہ لکھنا اس لیے کہ میں نے اس سے توبہ کر لی ہے!

ان حالات میں دیوانِ بقا کے قلمی نسخے کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ ہم نے جو نسخہ شائع کیا ہے وہ ڈاکٹر اشپرنگر کے ذخیرۂ مخطوطات کی زینت رہ چکا ہے اور پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آیا ہے۔

---

[1] لطف: گلشنِ ہند ص ۷۱

اِس نسخے کا ترقیمہ یہ ہے :

"تمام شد دیوان ہندی تصنیف بقا بتاریخ بست یکم شہر ذی الحج سنہ ۱۲۴۱ھ روز جمعہ"۔

کاتب کا خط بہت اچھا ہے لیکن بلا کا غلط نویس ہے۔ اسی لیے متن کے تیار کرنے میں بہت سی دشواریاں پیش آئیں۔ اس کام میں پروفیسر ضیاء احمد بدایونی اور جناب رشید حسن خاں نے بڑی جان کھپائی ہے اور میں ان دونوں حضرات کا بے حد ممنون ہوں۔ جہاں الفاظ پڑھنے میں نہیں آئے وہاں نقطے لگا دیے ہیں یا خط کھینچ دیا ہے۔ بقاؔ کے جو اشعار مختلف تذکروں میں ملتے ہیں ان سے مقابلہ بھی کر لیا گیا ہے۔ اس کلیات کی طباعت میں مولانا امیر حسن نورانی نے جو تکلیف اٹھائی اس کا بھی شکر گزار ہوں۔

خواجہ احمد فاروقی

مخفّفات

ن : مجموعۂ نغز

ل : گلستانِ بے خزاں

م : تذکرۂ میر حسن

ش : گلشنِ بے خار

ہ : تذکرۂ ہندی

ک : کریم الدین

گ : گلِ رعنا

آ : آبِ حیات

ز : گلزارِ ابراہیم

شع : شعرالہند

د : دستور الفصاحت

مج : مجمع الانتخاب قلمی

ع : تذکرۂ عشقی

س : انتخابِ حسرت موہانی

سخ : سخنِ شعرا

دیوانِ بقا

غزلیات

وہ انگارا ہے پہلو میں دلِ بیتاب آتش کا
کہ دیکھے سے جسے ہو جائے زہرہ آب آتش کا

دلِ بیتاب چھُٹ اپنے کہ سوزِ غم سے خوگر ہے
نہ دیکھا ہم نشیں ہوتے کہیں سیماب آتش کا

جلا کرتے ہیں تربت میں بھی ہم دل تفتگاں، سچ ہے
جلا آتش کا جو ہو شے، سو دیکھے خواب آتش کا

بڑے اُستادِ غم سے، مکتبِ ہستی میں، ہم پیارے
کتابِ چار عنصر سے، پڑھے ہیں باب آتش کا

بقاؔ نے روز و شب رو رو کے، آبِ چشم سے اپنے
نشاں آخر کو عالم میں کیا نایاب آتش کا

قضا نے حالِ کُل، جب صفحۂ تقدیر پر لکھّا
مری دیوانگی کا ماجرا زنجیر پر لکھّا

ضعیفی سے نہیں پیروں کے جبیں پیشانی رُو پر
یہ خطِ نا امیدی ہے کہ لڑے پیر پر لکھّا

نہیں تجھ سے ہمیں دعوائے خوں، گر شمع نے، قاتل
اب اپنے خوں کا محضر گردنِ گلگیر پر لکھّا

یہ سب مضموں ہے شیریں، کوہکن کی روسپیدی کا
جہاں تک موج نے سطروں کو جوئے شیر پر لکھّا

بقاؔ کے دل میں آ، آئینہ تیری قدر کیا جانے
عبث ہے نقشِ گُل گر بلبلِ تصویر پر لکھّا

خالِ لب آفتِ جاں تھا، مجھے معلوم نہ تھا
دام، دانے میں نہاں تھا، مجھے معلوم نہ تھا

خواہشِ سُود تھی، سودے میں محبّت کے، وے لے
سربسر اُس میں زیاں تھا، مجھے معلوم نہ تھا

باتوں باتوں میں مرے سر کو کٹاوے گا رقیب
اس قدر سیف زباں تھا، مجھے معلوم نہ تھا

میں تو آیا تھا بقاؔ باغ میں، سُن جوشِ بہار
پر یہ ہنگامِ خزاں تھا، مجھے معلوم نہ تھا

ست ناصح جو مرے جیب کو اِس بار لگا — پھاڑوں ایسا کہ پھر اُس میں نہ رہے تار لگا

نچی اُس بُت کو خبر نالۂ تنہائی کی — مدّعی کون کھڑا تھا سرِ دیوار لگا

ںِ عشق تمھارا تو یہ طوفاں ہے، کہ میں — جس سے مذکور کیا، اس کو یہ آزار لگا

س کا ملّاح بنا عشق، وہ کشتی ڈوبی — اُس کے کھیوے سے تو بیڑا نہ کوئی پار لگا

رغ زیرک تھے، تہِ دام نہ آئے ہرگز — اُڑ گئے ہم سرِ صیّاد پہ منقار لگا

رد یہ دل میں اُٹھا رات، کہ ہو گرمِ تپش — اُڑ گیا سوئے فلک میں پرِ احرار لگا دکذا

دۂ خاک سے دی مجھ کو کسی نے آواز — گور ہموار تھی سننے جو میں یکبار لگا دکذا

ر تو غفلت زدہ تا خوابِ عدم ہے یاں تو — دیکھ لے ہم کو نہ ٹک دیدۂ بیدار لگا

ب میں دیکھوں ہوں تو کثرت ہی خریداروں کی — گھر میں اس غیرتِ یوسف کے ہے بازار لگا

کھینچ پیچھے کو قدم آہ میں یاں تک رویا
کہ مرے آگے بقاؔ دُر کا اک انبار لگا

یہ تو سنگ و خشت سے اے شیخ مل بنا — کچھ سنگ بچ رہا تھا، سو اُس بُت کا دل بنا

تا ہوا ضعیف کہ میرے مزار پر — جو برگِ گل پڑا ہے، سو چھاتی کا سِل بنا

ہو کر سیہ بقاؔ کا ستارہ نصیب کا
روزِ نخست عارضِ خوباں کا تل بنا

ش، ک : یک بار۔ سخ: جیب ناصح جو مرے ہاتھ کو اک بار لگا۔ ۲ہ، یار کو بھیجی خبر۔ د، گ، ش، ک : یار کو پہنچی خبر

ہ، د، ش، ک، س : پسِ دیوار

س۔

س : سو عاشق کا دل بنا

سیکھا جو قلم سے نے حنائی کا بجانا کر نغمہ بقا فکرتِ عالی کا بجانا

تسمہ مرے مست دل پہ دوالی کا بجانا یہ لٹ جو ہے، چابک اسی کالی کا بجانا

مارا کیے مطرب بجگاں دل پہ تھپیڑے سیکھے اسی طبلے پہ وہ تالی کا بجانا

الفت میں تری اے بُتِ بے مہر و محبت آیا ہمیں اک ہاتھ سے تالی کا بجانا

لے مول مرے دل کا وہ جب [ساغرِ نازک] یاد آوے نہ کاش اُس کو سفالی کا بجانا ڈ

اس نالۂ بے صوت نے حیرت میں سکھایا ساز اب مجھے تصویرِ نہالی کا بجانا

بس اے غمِ غمّاز، مری آہِ جگر سے آفت ہے ترا بام پہ تھالی کا بجانا

بے ساقی و مے، سوچ میں، ہے کام ہمارا بیٹھے سرِ ناخن سے پیالی کا بجانا

اُس کو دکِ بے ہوش کا، آفت ہی، شب اُٹھ کر ٹھیکوں پہ مری آہ کے، تالی کا بجانا

سنتا ہوں کسی پیچ کی جب دف زنیِ فکر آتا ہے مجھے یاد ڈفالی کا بجانا

کرتا ہے بقا نالہ، تو کر جھانج میں دل سے
بے جھانج ہے کیا اس دفِ خالی کا بجانا

قلم صفت میں بس از مراتب بدن ثنا میں تری کھپایا
بدن زباں میں، زباں سخن میں، سخن ثنا میں تری کھپایا

بہ رنگِ شمع و دوات خامہ، ترے طریقِ ثنا کا جویا
کبھی ہے ساکت، کبھی ہے نالاں، کبھی ہے راقم، کبھی ہے گویا

چھلک کے دیدۂ تر ہے مُغاں! پیالا سا بغل میں پھوٹ بہا شیشہ دل کا چھالا سا

کل[۱] دستِ محتسب سے جوں توں مجھے چھڑایا
شیشے نے میری خاطر اپنا گلا بندھایا

اُس[۲] کف میں دیکھ ساغرِ نازک شراب کا
دریا میں سرنگوں ہے پیالہ حباب کا

ہم[۳] نفس کوئی نہ دیکھا بے کسی کے دن بقا
آشنا صورت مگر معنی میں وہ بے گانہ تھا
سرسری[۴] مل کے، مرے پاس سے جانا کیا تھا
راہ بس ناپنے آئے تھے، یہ آنا کیا تھا
شب اوس شکر لب کی کروں یاد میں گر خواب
تو خواب نہ آوے، مگر آوے تو شکر خواب

مت تنگ ہو، کرے جو فلک تجھ کو تنگ دست
آہستہ کھینچیے، جو دبے زیرِ سنگ، دست
کل ہے حنا سے، گاہ مرے خوں سے سرخ ہو
سو سو طرح سے، اُس کے دکھاتے ہیں رنگ، دست
دیتا ہے کف سے دولتِ پا بوس شمع کی
رووے گا سر پہ دھر کے پھر آخر پتنگ، دست
پھر آنکھ تجھ کو غیر نے دیکھا، تو پھر مرے
لیویں گے انگلیوں ہی سے کارِ خدنگ، دست
از کُشت و خونِ بے گنہاں، آستیں سے تو
باہر نکالتا ہے کب اے خانہ جنگ، دست
مفت اس کے ہاتھ اب جو بقا سا لگے شکار
پھر کب کرے قصور یہ چرخِ پلنگ دست

ہیں اُس زلف و رخ کے ہم بیہات
رات کو دن کریں ہیں، دن کو رات

م   ۲۔ ن   ۳۔ گ   ۴۔ خ

مخطوطے میں اس غزل پر یہ عنوان لکھا ہوا ہے: "استدعاے بوسہ از شیخ جی"۔ عنوان بظاہر غیر ضروری کا
م ہوتا ہے اس لیے متن میں نہیں لکھا گیا۔

کیوں نہ شانے سے دب چلیں یہ شوخ
جن کی چوٹی لگی ہے اُس کے ہات

چڑھ کے اسپِ اجل پہ، ہستی سے
شیخ جی لے گئے عدم کو برات

عکسِ حق ہوں جہاں کے آئنے میں
میری اور اُس کی ایک ہیں حرکات

چاہیے ٹک اُدھر سے حُسنِ قبول
پھر تو ہیں سیّآت بھی حسنات

اُس خطِ پشتِ لب نے چھوڑا ہے
آبِ حیواں پہ پردۂ ظلمات

بوسہ دینے میں لب کے سوچو مت
ہے یہ حق میں بقا کے آبِ حیات

دل دیکھ کے رہتا ہے ہر آن تری قدرت
دُرّاج صفت گویاں، سبحان تری قدرت

ہم کو جو کچھ مفید جہاں کا نہیں علاج
شاید مریضِ چشمِ بتاں کا نہیں علاج

نکلے ہے منہ سے بات بہ لکنت ترے حضور
گو دل رہے بجا، پہ زباں کا نہیں علاج

بے کل رہے ہے نت کے لچکنے سے وہ کمر
اُس مومیاں کے موے میاں کا نہیں علاج

کہتا ہے دق ہو غنچۂ گل سے، وہ خوش دماغ
دنیا میں تجھ سے گندہ دہاں کا نہیں علاج

سُن دردِ دل کو میرے لگا کہنے یوں طبیب
ہر درد کی دوا ہے، پہ یاں کا نہیں علاج (کذا)

لاؤں جو شکوۂ شبِ ہجراں سخن کے بیچ
جوں شمع پھر زباں نہ سماوے دہن کے بیچ

اِس باغ میں شگوفۂ نورس تو ہوں، ولے
سوچاک مثلِ گل ہیں مرے پیرہن کے بیچ

کھا لالہ داغ، صحنِ چمن سے نکل گئے
خونیں دلوں کو چین کہاں ہے وطن کے بیچ

لے جا کے بوے زلف تری، بادِ صبح نے
خوں کر دیے ہیں نافۂ آہو، ختن کے بیچ

اِتنا گھُلا ہوں حسرتِ دیدار سے کہ اب — جز چشم کچھ رہا نہیں باقی بدن کے بیچ

جلدی پہنچ کہ اشک کے دریا میں جوں حباب — دم آ رہا ہے یار ہمارا نین کے بیچ

یکتائے روزگار بھی ہو، تا بقا تجھے (ق) — پہنچے کمال مرتبہ شعر و سخن کے بیچ

یک شعر مثلِ دردؔ تو ہرگز نہ کہہ سکے
ہر مو اگر زبان ہو تیرے بدن کے بیچ

اے جنوں! یمنِ قدم سے ترے، اک آن کے بیچ — پڑ گئی لاگ مرے دست و گریبان کے بیچ

تشنہ کاموں سے نہ مُنہ موڑ کہ جب خط آیا — پھر تو یہ آب کہاں چاہِ زنخدان کے بیچ

خونِ عاشق کے لیے سحر ہے یہ سرخیِ لب — کیا کھلایا ہے رقیبوں نے تجھے پان کے بیچ

آ کے کرتا ہے خلل شانہ، جو عشّاق کے دل — جمع ہوتے ہیں تری زلفِ پریشان کے بیچ

کیوں نہ گردش میں رہے، ہم سا جو کوئی آوارہ — خاک ہو کر ہو ملا ریگِ بیابان کے بیچ

بانگِ تکبیر تو ایسی ہے بقا سینہ خراش
انگلیاں آپ مؤذن نے دھریں کان کے بیچ

ے، خون کی جا، اپنی تو رگ رگ میں رہی لچ — زاہد ہی کوئی خشک ہے جو اس سے گیا بچ

بوں دل شدے نالاں ہیں ترے جلوے کے ہنگام — جوں موسمِ گل، بلبلوں میں دھوم رہے مچ

ے خال، تری زلف میں کب دل ہو گرفتار — جو مرغ پھنسے دام میں، دانے ہی کی لالچ

ل دھرنے کی جا گہ نہیں اِن میں ہے، چہ جا دل — زلفوں میں بھرے ہیں تری، دل ایسے مچامچ

ہے جیسی بقا کی غزل، ایسی نہ ہو مضبوط
سودا جو کوئی ریختے کے گھر پہ کرے گچ

کھب گئی چشم میں جب سے کمرِ یار کی طرح
رگِ گل دل میں کھٹکتی ہے مرے خار کی طرح[1]

ہائے کیا درد ہے سینے میں دلِ محزوں کو
رات دن اب تو کراہے ہے یہ بیمار کی طرح

دید کو تیری، شب و روز کھلی رہتی ہیں
چشمِ حیرت زدگاں، رخنۂ دیوار کی طرح

تو وہ یوسف ہے کہ دن رات خریداری کو[2]
آمد و رفت ترے گھر میں ہے بازار کی طرح

پہلے جو پانو تری سمت پڑے، اُس پہ بقاؔ
دوسرا پانو تصدّق کرے، پرکار کی طرح

دکھتا تھا جب کہ اشکِ جہاں گرد رنگِ سرخ
ہر دشت، لالہ زار تھا۔ ہر کوہ، سنگِ سرخ

دل خوں ہے غم سے اور جگر، یک نشد دو شد
لب خشک ہیں تو چشم ہے تر، یک نشد دو شد

رسوا تو نالہ کر کے ہوئے، لیکن اُس نے یار
دل میں ترے کیا نہ اثر، یک نشد دو شد

اول تو ہم کو طاقتِ پرواز ہی نہ تھی
تس پر بُریدہ ہو گئے پر، یک نشد دو شد

پایا نہ ہم نے سود محبّت میں یار کی
اس پر بھی پہنچتا ہے ضرر، یک نشد دو شد

چھڑکا مرے جگر پہ نمک، غیر سے رہا
پیوستہ مثلِ شیر و شکر، یک نشد دو شد

آوارہ جوں صبا ہوں، پر اب جستجوے یار
رکھتی ہے مجھ کو خاک بسر، یک نشد دو شد

مشکل تھا دیکھنا ہی ترا، تس پہ روزِ وصل
لائی نہ چشم تابِ نظر، یک نشد دو شد

نالاں ہم اپنے اشک کے ہاتھوں تھے، اب بقاؔ
بہنے لگیں ہیں لختِ جگر، یک نشد دو شد

---

[1] ن، س: کھٹکتی ہے
[2] ن: خریداروں کی

...کھتا ہے یوں وہ زلفِ سیہ فام دوش پر — صیّاد جس طرح سے دھرے دام دوش پر

...سانے تلک چڑھے بن، اب آنسو کو کب ہے چین — سچ ہے کہ ہووے طفل کو آرام دوش پر

...ک دن ملا جو شیخ، تو پھر میکشوں کے ساتھ — سر پر لیے پھرے گا سبو، جام، دوش پر

...نا تو آج بھی نہ ہوا شب کو (اور) اُٹھا — ایفائے وعدہ، اے بتِ خود کام دوش پر

...ے دل میں، گھر کو شہر سے صحرا میں لے چلیں — اٹھوا کے آنسوؤں سے در و بام دوش پر

...زشت بخت ہوں کہ ملائک کو بھی مرے (ق) — لکھنے کا پیش آئے جو کچھ کام دوش پر

...لی مری تو نام بدوں کے کریں رقم — زشتی لکھیں بدوں کی مرے نام، دوش پر

...رب بچوں نے شیخ کو ٹنگیا لیا تمام — لی وقت جالے خلعت انعام دوش پر (اکذ...

ڈالا نہ بارِ عشق زمیں پر بقا نے یار
سر سے اگر گرا، تو لیا تھام دوش پر

...ے جو ناز سے مرا وہ بتِ سیم بر بہ بر — کاہے کو لے پھرے مجھے میرا نصیب دربدر

...ں بہ چشم، رو بہ رو، سینہ بہ سینہ، دل بہ دل — ساق بہ ساق و لب بہ لب، پائے بہ پائے، سر بہ سر

...رہو ہو ہر باں غیر کے ساتھ اس طرح — اور میں پھروں ہوں خوار و زار خانہ بہ خانہ، گھر بہ گھر

...تِ مہر وش کبھی ٹک تو نگاہِ گرم ہو — اشک سے کب تلک رہیں دامن و جیب تر بہ تر

دامِ بلا سے اب بقا ہم سے اسیر کب چھٹیں
رشتۂ غم سے گتھ گئے بال بہ بال، پر بہ پر

...ے اس دل کو نظروں میں جھپٹ کر — مبادا یہ لگے جادو پلٹ کر

...ں : رکھے

رے مژگاں سے کب تک نیزہ بازی — وہ غمزہ ناز کا مرکب ڈپٹ کر
ہوا الماسِ غم سینے میں کاری — جگر بہتا ہے چشمِ تر سے کٹ کر
گدازِ غم سے ان لیلیٰ وشوں کے — ہوا ہوں بیدِ مجنوں، غم سے لٹ کر
ڑی ہے بیخ دیں کعبے کے در پر — مبادا گر پڑے زاہد اُلٹ کر
ہماری چشمِ تر کے گھر سے یارب — کہاں جاتا ہے طفلِ اشک ہٹ کر
شبِ فرقت میں چشمِ تر کا دریا — ہوا پل بند، لختِ دل سے پٹ کر
نہ نیند آتی ہے، نے گرتا ہے سر سے — عروسِ صبح کا مقنع اُلٹ کر

بقا، روشن چراغِ چشمِ تر رکھ
فتیلہ رشتۂ مژگاں سے بٹ کر

قاتل جو ملے مجھ سے کفن نذر پکڑ کر — دھر دوں میں چھری اور لگن نذر پکڑ کر
وہ شامِ غریباں ہے تری زلف کہ جس سے — رخسار ملا صبحِ وطن نذر پکڑ کر
ناگن کے تصور میں تری زلف سے آ کر — کالے بھی جو ملتے ہیں تو من نذر پکڑ کر
نکہت پہ تری زلف کی ملتے ہیں صبا سے — نافے کو سب آہوے ختن نذر پکڑ کر
دریا پہ دمِ گریہ مری چشم سے آ کر — ملتی ہے صدف، دُرِ عدن نذر پکڑ کر
تیرے دہنِ تنگ سے ہنگامِ تبسم — ہر غنچہ ملا دل بہ دہن نذر پکڑ کر
گردش سے تری نرگسِ فتاں کی زمانہ — آخر کو ملا اپنا چلن نذر پکڑ کر
وہ ماہِ محرم تری ہجرت ہے کہ جس سے — ہجرت کا محرم ملے سن نذر پکڑ کر
تو یار وہ گل ہے کہ ترے سامنے آوے — منقار میں گل مرغِ چمن نذر پکڑ کر
اُس زلفِ شکن دار سے دل ہائے شکستہ — ملتے ہیں بہم اپنی شکن نذر پکڑ کر
جس دم ملے تجھ سے کوئی عاشق تنِ بے جاں (ق) اپنا تن و جاں سرّ و علن نذر پکڑ کر

تو اُس کے تن وجاں سے ترے سامنے آوے
تن جان کو اور جان کو تن نذر پکڑ کر

ہم طائرِ نو گلشنِ دنیا میں ہیں صیاد
مت ہم سے تو لے دامِ کہن نذر پکڑ کر

جب ڈر نہ پڑے رم میں، تو آخر کو ہوئے رام
وحشت تری آنکھوں کو ہرن نذر پکڑ کر

توسن پہ تجھے دیکھے تو ...... آوے
ہاتھوں میں صبا بوے سمن نذر پکڑ کر

....

اب کیونکے رہوں شہر میں بے یار کہ وحشت
آئی ہے مرے سامنے بن نذر پکڑ کر

گردوں پہ فقط لے گئے سر اپنا مہ و مہر
قاتل کو زمیں بیچ بدن نذر پکڑ کر

دیکھے لبِ لعل اُس بُتِ ہندی کا تو اس کو
دل جائے عقیق، آئے یمن نذر پکڑ کر

اُس ظالمِ بیدرد سے ہم دردِ دل اپنا
کہتے ہیں ولے چوب و رسن نذر پکڑ کر

پاتا ہوں دمِ فکر بقا بات میں بات
ملتا ہے سخن مجھ سے سخن نذر پکڑ کر

اُس صید فگن نے جو دھرا دام زمیں پر
اک صید کا ہرگز نہ رہا نام زمیں پر

گردوں پہ گیا دور میں اُس لب کے مسیحا
یعنی کچھ اب اُس کا نہ رہا کام زمیں پر

شیشہ تو فلک پر ہے سدا جام زمیں پر

تُرکی اُس چشم کی ہے ابروے خمدار کے زور
چھین لیتی ہے دلِ خلق وہ تلوار کے زور

ن : یعنی کہ

د

جھکو نہ اب دل ہے نہ جاں ہے عزیز — پر وہ بتِ جانِ جہاں ہے عزیز

بر سے کہتا ہے مرے حق میں یار (ق) — دیکھو[1] تو اِس دم وہ کہاں ہے عزیز

ر پہ جو بیٹھا ہو تو اُس سے کہو — جائے، جو اپنی اُسے جاں ہے عزیز

ر اُسے معلوم نہیں ہے کہ جان — عاشقِ بیدل کو کہاں ہے عزیز

مجکو[2] بقا بہرِ سخن خامہ وار

سارے بدن میں یہ زباں ہے عزیز

سب رنگِ عاریت وہ سمجھتا ہے ننگِ ناز — بہتر ہزار رنگ سے اُس کا ہے رنگِ ناز

نچلا رہا کبھو نہ مرا طفلِ نے سوار — کرتا ہے شوخیوں سے نت اُٹھ کر (وہ) تنگِ ناز

دامن نہ چھوڑوں میں، تو چھڑاوے جھٹک جھٹک — کرتی ہے مجھکو قتل اب اُس کی یہ جنگِ ناز

ر خود غلط ہمیں ہیں، کچھ اُس کا نہیں قصور — یاں وقفۂ نیاز ہے، واں ہے درنگِ ناز

ہے سخت رو بہت پسرِ شیخ، دیکھیے — پڑتا ہے کس کے شیشۂ دل پر یہ سنگِ ناز

ہے مجھ نیاز مند کو کچھ اور ہی اُمنگ — یارو، میں کیونکے شعر میں باندھوں امنگِ ناز

شوخی یہ ہے کمیتِ قلم، اس کو پھر بقا

جولاں دے اس زمیں میں ذرا کس کے تنگِ ناز

میں ہو چکا ہوں یار نشانِ خدنگِ ناز — زان پیشتر کہ سوی من آیی بجنگِ ناز

اُس ابرو کی کماں سے لگے دل پہ پے بہ پے — تیرِ نگاہ ۔ ناوکِ غمزہ ، خدنگِ ناز

---

1 ج : دیکھیو

2 ن : مجھ کو تو بہرِ سخن اب خامہ دار

یہ دور میں نہیں نگہ اُس ترکِ چشم کی — در پردہ میزند بدلِ من تفنگِ ناز
آہوئے چشمِ یار نہ ہوئے کسی کا رام — در گردنش اگر نبود پالہنگِ ناز
نازِ بتاں اُٹھا نہیں سکنے کا تو بقا
زن بوسہ و بہل کہ گرانست سنگِ ناز

دلا، اُٹھائیے ہر طرح اُس کی چشم کا ناز — زمانہ با تو نسازد، تو با زمانہ بساز

ہے تپاں زیرِ زمیں کون جگر چاک ہنوز — کہ تزلزل میں رہے ہے کرۂ خاک ہنوز

جو چشم و دل سے چڑھا دوں نالے بہ آب اوّل دوم بہ آتش
تو ماہ و خور کے بھروں پیالے — بہ آب اوّل دوم بہ آتش
جو چشم رووے، تو دل بھی آہوں میں میری لختِ جگر پروئے
بچے وہ سمرن تری، یہ مالے — بہ آب اوّل دوم بہ آتش
جو کوئی تربت پہ میری گزرے، تو تابِ اشک و تبِ فغاں سے
پڑیں وہ ہر ہر قدم پہ چھالے — بہ آب اوّل دوم بہ آتش
اگر آہِ بیچاں اشک شب کو فلک پہ گردش کناں چڑھے گا
تو گردِ مہ دو پڑیں گے ہالے — بہ آب اوّل دوم بہ آتش
سرشک و آہ اب یہ بے اثر ہیں کہ جا فلک تک شبِ جدائی
درِ اثر پہ یہ دے ہیں تالے — بہ آب اوّل دوم بہ آتش
باد، فرقت میں چشم و دل کی، یہ اشک ریزی اور آہ خیزی
بلائے ناگہ جہاں پہ ڈالے — بہ آب اوّل دوم بہ آتش

فلک سے دیووں کی طرح اُس بن، سرشک و آہِ بقا سے اب تو
چڑھے ہیں لڑنے کو دو رسالے بہ آب اوّل دوم بہ آتش

در سے ہم کو نہ آئی کبھی در پیش غرض
در نہ رکھتے ہیں سبھی شاہ سے درویش غرض

برے لگ چلنے سے ڈرتے ہیں ہم اے کژدمِ عشق
عاقبت ہم پہ لگانا ہے تجھے نیش، غرض

بیش و کم پیار کے رمزوں سے یہ معلوم ہوا
یار کچھ ہم سے بھی رکھتا ہے کم و بیش غرض

دل کے لینے ہی تلک یار تھے، بس، ہم نے میاں
تم سا خود کام نہ دیکھا کوئی اور خویش غرض

خوں مری چشم سے ہوتا ہی نہیں بند بقا
ابھی بہتا ہے یہ ناسورِ دلِ ریش غرض

آویں سمس (کذا) میں جو وہ رخسارِ آتش رنگ و شمع
تو نہ ہوں ہم سنگِ یکدیگر مگر یا سنگ و شمع

وقتِ شب گیر .... اس کے تھے ہم بھی پئے محمل رواں
گوش و چشم اپنے لگائے بر صدائے زنگ و شمع

میل تجھ سے سنگ دل کا، گو نہیں ہیں موم دل
نسبتِ آتش تو باقی ہے میانِ سنگ و شمع

راہ دکھلاتا ہے لیکن آپ چل سکتا نہیں
خضرِ رہ اچھا ہے ناصح پر بہ پائے لنگ و شمع

محتسب بگڑے، تو دیں ہم مست شمع اُس کی جلا
تا رہے مشہور مست و محتسب کی جنگ و شمع

بزم آرائی کرے وہ باغ میں شب کو، تو ہو
فندق اُس کے دست و پا کی غیرتِ اورنگ و شمع

باسرود و نالہ تھا شب کو دلِ سوزاں مرا
بزمِ عشرت میں تری، غیرتِ فزائے چنگ و شمع

شمع رو دنیا کے، عاشق ہیں قبائے تنگ پر
کچھ بھی نسبت ہے بھلا یارو، قبائے تنگ و شمع

وہ چراغِ دیر گر روشن کرے شمعِ حرم
نسبتِ طور و تجلّی دے میانِ سنگ و شمع

.... بقاؔ
رہ نمائے شب ہے کافی ایک ہیش آہنگ و شمع

گُل کو ہے بلبل سے مگر قصدِ جنگ — غنچے کے ترکش میں بھرے ہیں خدنگ
لاف زنی حُسن کی کر یار سے — غنچہ صفت مجھ کو نہ لائے بتنگ
بارِ الہا، کہیں جا وے نگل — یونسِ نسریں کو خزاں کا نہنگ
آتشِ رخ سے تری اے شمع رو — جل گئے ہم سے کئی ہو کر پتنگ

دل پہ مرے عشق ہے اب پنجہ زن
دیکھ بقاؔ کُشتیِ بازو کلنگ

ساتھ غیروں کے جو دیکھا تجھ کو پیتے مل کے مُل — صبر کے دریا کا توڑا چشمِ تر نے پل کے پُل
حاجتِ سیرِ چمن پھر کیا ہے، جب وقتِ خرام — ہوں شگفتہ تیرے ہر نقشِ قدم سے گل کے گُل
دل کو لائق ہے بہ رنگِ شانہ اُن زلفوں سے شغل — وہ خمِ گیسو نہ ہوں گو گردنِ شاغل کے غل
تھ کا تیرے فلک، ہر چند ناخن ہو ہلال — تو بھی کُھلنے کے نہیں عقدے مری مشکل کے کُل

رگسِ مست تری جائے جو تُل بر سرِ گُل — تیغِ ابرو سے گرائے سرِ گُل بر سرِ گُل

وج زن دیکھ ترے حُسن کا دریائے بہار — باندھے بادِ صبا خاک کے پُل بر سرِ گُل

پی نازک بدنی سے جو ہو ساقی کو خبر — پھر تو ہرگز نہ پیے بیٹھ کے مُل بر سرِ گُل

ھول کر باغ میں تیرا جُزِ مجموعۂ حُسن — آج لائی ہے صبا آفتِ کُل بر سرِ گُل

گر بقاؔ، ناز سے گویا ہو مرا غنچہ دہن
گردنِ غنچہ گرے شرم سے ڈھل بر سرِ گُل

ر ترے در پہ نہاں زیرِ زمیں کھویا دل — دیکھیں کیا لائے ثمر، خاک میں اب بویا دل

ون سا آئنہ رو اُس سے مقابل ہی کہ اب — مثلِ طوطی ہی کے رہتا ہے مرا گویا دل

ضعفِ پیری سے بقاؔ راہ کا کٹنا معلوم
قدمِ خفتہ نہ جاگا تھا کہ اب سویا دل

ہ دبے لب کی جو تقریر تلے شیشۂ مُل — لے بہ اندازِ نگہ تیر تلے شیشۂ مُل

آج شب اتنی پلا مے، کہ بہک کر ساقی — لب پہ لوں شمع کو، گلگیر تلے شیشۂ مُل

..... مے مجھے ایسے سے نہ دے پیرِ مغاں — ..... مے ناب کی تاثیر تلے شیشۂ مل

یرے دیوانے کو ہاں ہاں ہوں ...... — کہ مبادا اہلے زنجیر تلے شیشۂ مل

یریِ آنکھوں کے تو بیمار ادب سے ساقی — وقتِ قارورہ نہ لیں کیر تلے شیشۂ مل

طفل قاضی سے ہو ہم چشم، تو غالب ہے کہ لے — موجِ مے درّۂ تعزیر تلے شیشۂ مل

یوں مے اُس چشم سے بہکے ہے کہ ــــ — ــــ اُس کی ہو تصویر تلے شیشۂ مل

گردن و سینہ ہے یوں اُس ــــــ — جیسے ڈھانکے کوئی زنجیر تلے شیشۂ مل

یرے گھر چل تو وہی تجھ کو پلاؤں زاہد — نکلے حدّت سے جو مے چیر تلے شیشۂ مل

بسکہ خونخوار ہے، رکھتا ہے ملا کر صیاد — دہنِ زخم سے نخچیر تلے شیشۂ مل
کشتہ کرنے کو ہے مس غم کی یہ آتش کے عوض — جام کے بوتۂ اکسیر تلے شیشۂ مل

هم بقا رند ہیں، گر ہوویں مریدِ زاہد
تو رکھیں توڑ کے اس پیر تلے شیشۂ مل

کرکے بآتابِ نگہ یاں تن و آتش کو بہم — ربط مژگاں سے نہ دے دامن و آتش کو بہم
مجھ سے کچھ ربط نہ تھا تجھ کو، مگر شکلِ چراغ — عشق نے جمع کیا روغن و آتش کو بہم
اشک آنکھوں کو فغاں لب کو، سخن لو بہلا (کذا) — کیونکے اس دل میں رکھوں خرمن و آتش کو بہم
دانہ اڑ جاوے چٹک تن سے، جو یوں سینے میں — اس تپِ دل سے رکھوں خرمن و آتش کو بہم
آتشِ دل سے ہوئی گرم وہ پیکاں، اے چشم — اشک سے سرد کر اس آہن و آتش کو بہم
گرمِ جولاں یہ ہوا آہ کہ ہم چھو نہ سکے — ایک سا پایا کے ترے توسن و آتش کو بہم
محوِ موسیٰ نے کیا طور کا وہ جلوۂ نور — تجھ سے پا دل میں مرے ایمن و آتش کو بہم
بن چکا بس یہ اِدھر، اور اُدھر آہوں سے جلا — لاگ ہے کچھ مرے اِس مسکن و آتش کو بہم
شمع ساں سر سے لگی یوں کہ کٹا یا جب سر — توڑا ربط مری گردن و آتش کو بہم
رخِ افروختہ اپنا نہ سمجھ ثانیِ شمع — کیا تناسب ہے رخِ روشن و آتش کو بہم

کیوں زباں سے نہ جلاوے تری چھاتی کو رقیب
حکم واحد ہے بقا دشمن و آتش کو بہم

اُس لب سے رسٹ نہ چوسے قدح اور قلح سے ہم — تو کیوں ملے سبو سے قدح اور قدح سے ہم

ساقی نہ ہووے پاس، تو کب جُرعۂ شراب — شیشے کے لے گلو سے قدح، اور قد

باقی رہے نہ بادہ، تو اُس کے عوض میں آب — لے خُم کی شست وشو سے قدح اور قد

گردش پہ تیری چشم کی بحثے ہے ہم سے یار (ق) — دعوے کی گفتگو سے قدح اور قدح

چشم اپنی ٹک دکھاوے اُسے تو کہ آوے باز — اس بحثِ دوبدو سے قدح اور قدح

بوسہ ترے دہن سے بہ ہنگامِ مے کشی — لے ہے کس آرزو سے قدح اور قدح

پاتے ہیں میکدے میں بقا نعمتِ[1] شراب
خم سے سبو، سبو سے قدح اور قدح سے ہم

یار کے نقشِ آستاں ہیں ہم — مٹ گئے جب، تو پھر کہاں ہیں

تیغ رانی ادھر بھی اے صیاد — کیا ہوا صید ناتواں ہیں

شمع ساں اشک و آہ سے اپنے — آب و آتش کے درمیاں ہیں

شبِ فرقت میں یار کی ہر چند (ق) — درپئے نالہ و فغاں ہیں

نالۂ بے اثر یہ کہتے[2] ہیں — مرغِ گم کردہ آشیاں ہیں

اے[3] بقا وقتِ نزع ہے، مل لیں
جب مندی آنکھ، پھر کہاں ہیں ہم

کیونکر بھلا رواں نہ رہے میری جوئے چشم — ہے اشک سے مدام جو آب آبر

اُس خاکِ آستاں کو کریں سرمۂ بصر — اے مردماں! یہی ہے مری آرز

حیراں ہے تب سے غنچۂ نرگس، بصد زباں — جب سے سنی ہے یار تری گفتگو

---

[1] ز: روزِ فیض سے   [2] ن: یہ کہتا ہے   [3] ج: آ بقا

کیا جانئے کس کے ہوں گے یہ گیسو وبالِ دل کس صاحبِ نظر کا یہ خط ہوگا موے چشم
نرگس کی طرح یہ بھی مبادا مریض ہو آئینہ بار بار نہ رکھ روبہ روے چشم
سرمے سے اُس کی چشم ہے گویا، مگر بقا
مقدورِ سرمہ نیست کہ بندد گلوے چشم

یکساں لگیں ہیں اُن کو تو دیر و حرم بہم جو پوچھتے ہیں دل میں خدا و صنم بہم
دیکھا تو ایک شعلے سے اے شیخ و برہمن روشن ہیں شمعِ دیر و چراغِ حرم بہم
باریک ہیں دہن سے ترے وقتِ خندہ یار کرتے ہیں دیدِ ہستی و سیرِ عدم بہم
ناصح ابنائے ترے، نہ ہماری سُنے گا تو کیا فائدہ جو بحث کریں دو اصم بہم
خرمستیوں پہ محتسب آتا ہے، چل بقا
باندھیں ہم اس حمار کے دونوں قدم بہم

مے پُرا، زاہد مجھے کہتا ہے، مے بھر دیں گے ہم
بھیجو مسجد میں اُٹھا اک شیشہ لا دھر دیں گے ہم

جب میرے دل جگر کی طلسمیں بنائیاں لبریزِ آبِ اشک کیں آنکھوں کی کھائیاں
دستِ حنا سے پھوٹ بہا آخرش کو خوں کیں پنجہ کرکے تجھ سے جو زور آزمائیاں
اُس آنکھ سے جب آنکھ ملائی، تو بحر نے چشمِ صدف میں موج کی پھیریں سلائیاں
کس فتنۂ زمیں سے یہ رہتا ہے شب دوچار اُڑتیں ہیں آسماں کے جو مُنہ پر ہوائیاں
اُس شمع رو نے، اپنے شہیدوں کی، جوں پتنگ گڑنے نہ دیں زمین میں لاشیں، جلائیاں
اس قندلب کی دید سے، اِن پتلیوں کو، مور کھاویں گے زیرِ خاک، سمجھ کر خطائیاں

تڑپے بہت، بہ جانبِ صیّاد آخرش قلّابِ عشق کی کششیں ہم کو لائیاں

تب[1] صورتیں جو پیشِ نظر تھیں، سو مثلِ اشک یوں گم ہوئیں زمیں میں کہ ڈھونڈھے نہ پائیاں

پاکر شفا بنفشۂ خط سے وہ انکھڑیاں صحت کے دن بھی خون سے میرے نہائیاں

مانا نہ ترکِ چشم نے، آخر کیا ہی قتل ہر چند دل نے دیں ترے لب کی دہائیاں

دیکھیں بقا کہ ہجر کے آئے پہ کیا بنے
اپنے تو ہوش اُڑ گئے سن سن ادائیاں

قابلِ شکوہ یہ اپنی ہی زباں ہے، کہ نہیں گلۂ جور ترا، ورنہ کہاں ہے کہ نہیں

معجزِ حُسن تمھارے سے، بھلا کوہِ سرِیں مو سے آویختہ، اے موکمراں ہے کہ نہیں

ٹک تو اندازِ تبسم بھی کہ اے غنچہ دہن کوئی کیا جانے کہ تنگی سے، دہاں ہے کہ نہیں

یہ معیّن ہے کہ نکلے گا وہیں اس کا سُراغ ورنہ اپنا دلِ آوارہ کہاں ہے کہ نہیں

زلف میں اُس کی، صبا! سلسلہ جنباں ہو کر جا کے آواز تو دے بجو، کوئی یاں ہے کہ نہیں

ہے یقیں یہ[2] تو مجھے ذبح کرے گا قاتل پر کوئی دم کے لیے جی کی اماں ہے کہ نہیں

امتحاں حسرتِ دیدار کا کرنا[3] ہے تو پھر دیکھیو، دیدۂ بسمل نگراں ہے کہ نہیں

یہ مرا ریختہ، رشکِ غزلِ سوداؔ ہے لیکن اُس پر بھی بقاؔ کو یہ گماں ہے کہ نہیں

بس مجھی کو نظر آتا ہے یہ یوں بے حرم (کذا)
تم بھی ٹک دیکھیو صاحب نظراں، ہے کہ نہیں

---

[1] ہ : دہ

[2] مج : پھر تو مجھے

[3] مج : امتحاں حسرتِ دیدار جو کرنا ہے تو پھر

سیلابِ شب سے آنکھوں کے رہتی ہے خرابے میں | بگڑی جو مرے دل کی بستی ہے دوآبے میں
اِس چشم کے ساغر میں، اے ساقیِ غم بھر دے | ہے کچھ مے خوں باقی گر دل کے قرابے میں
ہر صبح ترے در پر، کس جرم سے لاتے ہیں | خورشید کو ٹھلا کر گردوں کے ارابے میں
پتلی مری دیکھ اس کو، یوں دل کو جلاتی ہے | ماہی کو کریں بریاں جس طرح سے تابے میں
مت قتلِ مغاں کر کر، میخانہ کر و ویراں | اے چشمِ بتاں حاصل اِس خونِ خرابے میں

اب فکر بقاؔ تیری رکھتی ہے جو چالاکی
سو چال نہ دیکھی میں مرکب دو رکابے میں

جو جہاں کے آئنہ ہیں دل انھوں کے سادہ ہیں | دل میں جا دینے کو وہ ہر ایک کے آمادہ ہیں
قتل سے عاشق کے تو نے اب تو کھائی ہے قسم | آخر اے قاتل یہ باتیں پیش پا افتادہ ہیں
کل کے دن جو گردِ مے خانے کے پھرتے تھے خراب | آج مسجد میں جو دیکھا، صاحبِ سجادہ ہیں
بند میں مطلق جو مجھ کو خطرۂ صیاد ہو | ہوں اسیرِ دام، پر وضعیں مری آزادہ ہیں
راہ پیمایانِ اقلیمِ عدم سے یادگار | دامنِ صحرا میں اب باقی نقوشِ جادہ ہیں

چشم ساقی کی لیے ہیں تیغِ ابرو دوش پر
لگ نہ چل ان سے بقاؔ، یہ ترکِ مستِ بادہ ہیں

کیوں نہ مرغِ چمن اُس کا ہو نثارِ دامن | ہیں رگِ گل سے مرے یار کے تارِ دامن

---

[1] ن : سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے میں | ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دوآبے میں

[2] ج : ہے کندہ خطِ باطل مسجد کے کتابے میں

[3] ج : اصلاً۔

پیرہن، اور ہم ہیں غبارِ دامن — جی دھڑکتا ہے نہ ہوویں ترے بارِ دامن

نے چشم کے دریا میں جو کی طغیانی — آ لگی موجِ گہر تا بہ کنارِ دامن

ن کا ترے دامنِ زیں پہ دیکھا — کھب گئی چشم میں دامن سے بہارِ دامن

ت جانیو بلبل کو چمن میں گلچیں — مشتِ پر ہونے کو بس ہیں ترے خارِ[1] دامن

ہ سے واقف ہیں سو وہ گردوں کا — شفقِ شام کو سمجھیں[2] ہیں شرارِ دامن

چاک سے دستِ جنوں کے تو نہ دیکھا ہرگز
ایک حالت پہ بقاؔ اپنا قرارِ دامن

یہ چشم سے امیدِ وفا جو رکھیں — چاہیے اشک سے پہلے ہی وہ مُنہ دھو رکھیں

ہے بتوں کی، یہ عجب معجزہ ہے — سرمہ بھی دیویں اور آنکھوں کو سخن گو رکھیں

کیوں میں ڈروں، بات یہ کتنی ہے رقیب — گرچہ اک تیغ کی جا مو کمراں دو رکھیں

ادھر آوے گا، بھلا بہرِ نثار — صدفِ چشم سے ہم کچھ تو گہر دو رکھیں

ے دوا بھی ہو کچھ اس کے ہمراہ — دیں بتاں درد، تو یوں دیویں نہیں تو رکھیں

گا یہ کبھی ابرِ مژہ سے سرسبز — مزرعِ دل میں تو ہم تخمِ امل بو رکھیں

مفت بر کتنے ہیں یہ شوخ، بقاؔ میں جو کہا
دل کو رکھتے ہو، لگے کہنے کہ لا تو رکھیں

دو نوید[3]، بہار آئی باغ میں — سودے نے پھر کیا[4] ہے خلل سا دماغ میں

---

[1] : تارِ دامن — [2] مج : شفقِ شام سمجھتے ہیں

[3] : ساقی کو پھر نوید — [4] گ، ش، ک : پھر خلل سا کیا ہے

بلبل کے اشکِ سرخ کی پروا ہے کب اُسے
بو گُل کی باغباں کے بھری ہے دماغ میں

رکھتا نہیں ہے سوزِ محبت اگر پتنگ
ہر لحظہ کیوں گرے ہے وہ آ کر چراغ میں

انصاف دشمن ایک مرا یار ہے تو ہز
جو فرق جانتا نہیں طوطی و زاغ میں

دل کی سی اپنی کہیو تو اے گل کہ کیا ہے فرق
دستانِ عندلیب و صدائے کلاغ میں

ساقی بغیر مے کے بدل، اب چمن کے بیچ
جوں لالہ خونِ دل ہے ہمارے ایاغ میں

اب تو قبول قیدِ محبت کا نام ہے
کب کب بقاؔ شگفتہ تھا حالِ فراغ میں

استی پر ہم سے کس دن آئیاں
یار کی زلفیں جو ہیں بل کھائیاں

رحبا، رو رو کے اے ابرِ مژہ
روز ساون کی رُتیں دکھلائیاں

نگ مارا سر سے اور سر سنگ سے
سرنوشتیں جب مری دکھلائیاں

اغ میں اے ساقیِ غنچہ دہن
جب سے کیں ہیں تو نے زلف آرائیاں

نچۂ ہر گل ہے خمیازے کے بیچ
تاک لیتا ہے پڑا انگڑائیاں

جل کے خاکستر ہوا غم سے بقاؔ
اے میاں! اتنی بھی بے پروائیاں

آہیں افلاک میں مل جاتی ہیں
محنتیں خاک میں مل جاتی ہیں

صورتیں آبلہ ہائے دل کی
خوشۂ تاک میں مل جاتی ہیں

صیدِ بسمل کی نگاہیں صیاد
تیرے فتراک میں مل جاتی ہیں

نگہیں یار کی جوں تارِ رفو
جگرِ چاک میں مل جاتی ہیں

پوپلے زاہدوں کی، کھاتے وقت
ٹھوڑیاں ناک میں مل جاتی ہیں

تھلکیاں دل کی بقا دیکھوں گی (کذا)
زخمِ کا واک میں مل جاتی ہیں

ں ہے تو، اور چاک گریباں ہم ہیں — رشکِ سنبل ہے تری زلف، پریشاں ہم ہیں
چشم تری، ہم ہیں عصا کے محتاج — نت کی بیمار وہ، اور طالبِ درماں ہم ہیں
طی ہے خطِ سبز ترا، ہم گویا — دونوں عارض ہیں ترے آئنہ حیراں ہم ہیں
ں ہاے ترے ناز کے ہاتھوں اے یار — صدمہ پہنچے ہے ترے قلب کو، نالاں ہم ہیں
دوں کی محبّت میں اب اے سروِ سہی — سربسر داغ تو اور سروِ خراماں ہم ہیں
خمِ موتیرے، ہمارا تو رام — خاتمِ جم ہے ترے پاس، سلیماں ہم ہیں

تو سخن سنج بقا، نام ہمارا مشہور
خاتمِ جم ہے ترے پاس، سلیماں ہم ہیں

ے کہا گل نے، کہ ترک ملاقاتیں — غنچے نے گرہ باندھیں جو گل نے کہیں باتیں

اندام جو صرفے سے ٹک اک ناز کریں — کام لیں زلف سے، کاکل کو بس انداز کریں

ے طولِ شبِ جدائی، خدا نے ڈالا ہمیں قفس میں
ابھی تو شب ہے، سحر کہاں کی، سحر جواب ہو تو سو برس میں

نے منصب لکھے جس دن مری تقدیر میں — داغ کی نقدی ملی، صحرا ملا جاگیر میں

ں: بلبل نے کہا گل سے ۵۲ ن

دیکھیے منصب مجنوں پہ یہ لیلیٰ صفتاں   خاک میں ہم کو ملا، کس کو سرافراز کریں

اُس بزم میں پوچھے نہ کوئی مجھ سے کہ کیا ہوں   جو شیشہ گرے سنگ پہ میں اُس کی صدا ہوں
اے عشق! تو ہر چند مرادشمنِ جاں ہو   مرنے کا نہیں، نام کا میں اپنے بقا ہوں

دیکھ آئینہ جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں!   اس کا میں دیکھنے والا ہوں بقا، واہ رے میں

صاف ہر شیشۂ دل سے ہے ہر اک اس کا حباب
ے بھی کرتی ہے عجب جلوہ گری شیشے میں
گرمیِ مے سے پڑے آبلے یوں دل میں بقا
جس طرح ہو ویں حبابِ جگری شیشے میں

م سا کوئی میخوار گر اس بزم سے گم ہو   ہو خاک، عجب کیا ہے جو خشتِ سرِ خم ہو
بیدار نہ ہو کشتہ ترا خوابِ عدم سے   سرزد بھی مسیحا سے اگر نعرۂ قُم ہو
ر، مایۂ ادبار ہے عالم میں، وگرنہ   طاؤس کا کب نقشِ درم، آفتِ دُم ہو
تحقیق، کہ اس سخت زمیں پر ہو دوبارہ
گو توسنِ خامہ کا، بقا، آہنی سُم ہو

ے کب تک اس دلِ صد چاک کا پیوند ہو   اب یہ دیوانہ، الٰہی! خاک کا پیوند ہو

م ے ہ ے ے شع۔

سیخوارِ اِس چمن کا، میرا ہرا ایک استخواں بعدِ مرگ، اے کاش نخلِ تاک کا پیوند ہو
نے سے ہمیں اپنے یہ مطلب ہے کہ پوست ہو جدا تن سے، ترے فتراک کا پیوند ہو
ہو، زاہد! تری تاثیرِ زہدِ خشک سے اب جو طوبیٰ میں تری مسواک کا پیوند ہو
ہے بقا ہر جا شگاف اِن میں، مگر یہ لختِ دل
زخمہائے دیدۂ نم ناک کا پیوند ہو

زخمِ دلِ نازک پہ جِکلِم بخیہ مژگاں کو کرے کب سوزنِ عیسیٰ رفوگُل کے گریباں کو
ں بر تری بیمار آنکھوں کا، دمِ آخر چُواوے خضر بھی گر مُنہ میں اُس کے آبِ حیواں کو
ں لگا وے تا دمِ شمشیرِ قاتل بر تبسّم زیرِ لب پنہاں نہ ہو زخمِ نمایاں کو (کذا)
تا یوسفِ دل غرق اس میں حسن سے تیرے کیا ہے سرنگوں اعجاز سے چاہِ زنخداں کو
گرد باد آوارگی میں گرم ہوں اتنا اُڑیں اخگر، اگر جھاڑوں غبار آلودہ داماں کو
دانِ ابرو کب کریں ہم کو ہدف اپنا بجھا کر زہر میں جب تک نہ دے لیں آبِ پیکاں کو
بقا! وہ نالۂ پُرپیچ و تاب اپنی ہوا قسمت
کہ جس نے چرخ پر رکھا سرا اِس چرخِ گرداں کو

لے اے شمع رو! پھر وہ ترا پروانہ ہو جو جلے پروانہ وار، اور تجھ کو کچھ پروانہ ہو
یں آزاد ہو بندِ قفس سے ہم اسیر رشتۂ اُلفت سے گر صیاد کے، پر، دانہ ہو
، یا اغیار سے ہی، تجھ کو ابرو پر گرہ ہے تذبذب، جب تلک یہ عقدہ ہم پر وانہ ہو

: پھر مرا ہر استخواں۔ ۲ مج : ہیں۔
: نہ ہووے حلق تر بیمار کا تیرے دمِ آخر۔

جلوہ گر ہے یار اور سوتا ہے یوں غافل رقیب
کیا گنہ خورشید کا، گر چشمِ شپّر وا نہ ہو

اب بقاؔ، ایسی پڑی غم کی گرہ دل میں کہ یار
ناخنِ ابرو سے اُس کو وا کرے، پر وا نہ ہو

جو گریۂ مدام کی آنکھوں کو خو نہ ہو
محفل میں دل جلوں کی مجھے آبرو نہ ہو

ہرگز نمازِ عشق کی نیّت نہیں درست
جب تک کہ تازہ خونِ جگر سے وضو نہ ہو

قانع ہوں رنگِ زرد پہ اپنے، وگرنہ یاں
ہے کون وہ کہ زر کی جسے جست و جو نہ ہو

رخ اس کا دیکھ، آب جو ہو جائے آئنہ
خجلت سے پھر دوبارہ کبھی رو بہ رو نہ ہو

مژگاں کو ساتھ لے نہ گریں اشک کیوں بقاؔ
کس کام کا وہ دُرِّ نجف جس میں مو نہ ہو

تلِ عشاق کرو، تم سے تو ہاں یہ بھی ہو
سر سے موجود ہیں ہم، کاش میاں یہ بھی ہو

یار بگڑے، تو نہیں کینِ رقیباں سے خطر
ظلم لاکھوں ہیں جہاں، ایک وہاں یہ بھی ہو

بے وفائی کا تو کیا ذکر ہے یاں غیرِ وفا
یہ تعجب نہیں گر تم کو گماں یہ بھی ہو

لطۂ غیر میں تو مجھ سے اشارات نہ چھوڑ
ہے ظاہر میں تو وہ چال، نہاں یہ بھی ہو

ر اوروں پہ لگاتے ہو، کوئی ادھر بھی
ہیں جہاں لاکھ ہدف، ایک نشاں یہ بھی ہو

اہ بہتا ہے مرا لختِ جگر آنسو کی
گر وہ چل نکلے، تو پیچھے سے رواں یہ بھی ہو

ب تو میں دوست کو دیتا ہوں جگہ پہلو میں
گو مرے دل کی طرح دشمنِ جاں یہ بھی ہو

کے واں، حال مرا بھول نہ جانا ہمدم
عرضِ احوال میں آج اپنے، بیاں یہ بھی ہو

---

۵ س: آنکھوں کی

طلبِ غیر کے دم اُس نے بقاؔ کو نہ کہا
کہ مری بزم میں حاضر ہو فلاں، یہ بھی ہو

ں لافِ بلندی کس سند پہ راست ہو
سرکشی کا جامہ جب تیرے ہی قد پہ راست ہو

بستر، خشتِ بالیں، بس ہی ہم کو دہر میں
شیخ! تو کعبے میں سو، فرشِ نمد پہ راست ہو

لیا دیا پشتِ آہ کو دل میں شکست
جب وہ آ بھی دیدۂ تر کی مدد پہ راست ہو

و قد کا ترے پاسِ ادب سے ہے کھڑا
سروِ آزادِ چمن اب اپنی حد پہ راست ہو

ج بیں میں نہ ہو جا گو کہ اُس شمشاد کو
وہ کشش قد کی کب ایسے فرد دپہ راست ہو (کذا)

نہ اس اک حد سے روشن ہوں سب ورا خلق (کذا)
حمل جب واحد کا کرنا ہر عدد پہ راست ہو

سن بقاؔ یہ ریختہ اب شاعرانِ کج نہاد
کیوں نہ بیٹھیں مسندِ بغض و حسد پہ راست ہو

گو آہ سے جنگل نہ جلے، خشک تو ہو
اشک کی تفت سے گو جل نہ جلے، خشک تو ہو

کرتے ہوئے گر اشک مرے دامن کا
نالۂ گرم سے آنچل نہ جلے، خشک تو ہو

شک کے باعث جو مری آہ سے رات
زیرِ رخ تکیۂ مخمل نہ جلے، خشک تو ہو

ش! حسن کی گرمی سے ترے وقتِ عرق
تن پہ گر نیمۂ ململ نہ جلے، خشک تو ہو

یا موسمِ گل بے مے و مینا، جو مری
آہ کی برق سے بادل نہ جلے، خشک تو ہو

رونت کی سواری میں سبب گرمی کے
زیرِ راں گو ترے کوتل نہ جلے، خشک تو ہو

مریہ دلِ سوزاں ترے قلیاں کی چلم
آب نے سے جو یہ نرسل نہ جلے، خشک تو ہو

ے اے آتشِ دل اب کے گرمی سے جلا (؟)
چشمِ تر کی مری چھاگل نہ جلے، خشک تو ہو

ں بدخو ہے مرا اشک، خدایا اس کی
گو بہ خرمن ہوئی کونپل نہ جلے، خشک تو ہو

غرق ہے اشک میں گھر تجھ سے اب اے نالۂ گرم　　گو مرے دُکھ کا یہ منڈل نہ جلے، خشک تو ہو

اشک سے خامہ رہے جو مرے بس میں نہ بقا
گو تپ تن سے یہ بہل نہ جلے، خشک تو ہو (کذا)

کس[۱] نے چمن میں رنجہ کیا عندلیب کو　　غنچے رہے ہیں دانتوں میں داب اپنی جیب کو

تو نے اس طرح سے اے چرخ گرایا ہم کو　　کہ موئے پر بھی کسی نے نہ اُٹھایا ہم کو

شب[۲] گزری، اب اے سحر کے نالو　　پھر چرخ پہ برچھیاں سنبھالو
گر قتل کیا بقا کو خوباں　　اس بات کو مُنہ سے مت نکالو
پنہاں ہی بھلا ہے خونِ عاشق　　جانے دو اب اس پہ خاک ڈالو

صاف جی کر کے ملا تجھ سے ہزار آئینہ　　ہے ولیکن مری خاطر کا غبار آئینہ
رخ مرے یار کا دیکھے، تو کسی صورت میں　　سادہ رو اپنے تئیں دے نہ قرار آئینہ
زلف گر رُخ سے اُٹھا کر وہ کرے تجھ پہ نگاہ　　روزِ روشن ہو، یہ تیری شبِ تار آئینہ
مت حباب اس کو سمجھیو، کہ سدا رکھتا ہے　　تیرے ہاتھوں سے دلِ آبلہ دار آئینہ
تو وہ خود بیں ہے مری جاں، کہ ہر اک آن کے بیچ　　دیکھ لیتا ہے اُٹھا کر دو سہ بار آئینہ

اِس زمیں میں غزل اک اور کہوں شستہ و صاف
جس پہ سو جان سے ہو جاوے نثار آئینہ

---

[۱] ز۔　　[۲] ہ۔ ۵۔

...ہ ہیں، اُنھیں پشت دے یار آئینہ — جس گھڑی ہو ترے مکھڑے سے دوچار آئینہ

...ہ حیران رہے باغ میں بلبل، جس کو — چہرۂ گل سے دکھاتی ہے بہار آئینہ

...ت زلف و رخِ یار میسّر ہے تجھے — خوش گزرتی ہے تری لیل و نہار آئینہ

...وں اے دل اِسی حیرت میں کہ کس صورت سے — صحبت اُس یار سے کرتا ہے برآر آئینہ

...جب دیکھے ہے، گہ چہرہ، ترے ہاتھوں سے — ایک جاگہ نہیں رکھتا ہے قرار آئینہ

...ر خط کو، جو باقی رہے چہرے کی صفا — ہے یہ بہتر کہ ہو بے نقش و نگار آئینہ

شعر صاف ایسے ہی کہہ اور بقا طورِ غزل

جیسے زجّاجِ حلب کرتے ہیں یار آئینہ

...ب گلشن ہے ترے عکس سے یار آئینہ — تو یہ سمجھے ہے کہ ہے باغ و بہار آئینہ

...تے آتے ہیں ترے تیرِ نگہ سے مردم — یا زرہ پوش ہو، یا باندھ کے چار آئینہ

...ں آہوں نے کیا تیرے دلِ سخت کو آب — بارے، یہ سنگ ہوا آخرِ کار آئینہ

...ب فی الفور بھر آویں گے تری آنکھوں میں — بھر نظر دیکھیو مت صورتِ یار آئینہ

...ں نہ منصور کہوں اُس کو کہ نت رہتا ہے — عکسِ مژگاں سے ترے، بر سرِ دار آئینہ

...ا تیز دوی کل تئیں کرتی تھی صبا — آج بازی ترے گلگوں سے وہ ہار آئی نہ

اک غزل اور پڑھ ایسی کہ بقا محفل میں

حیرت اشخاص سے کر دیوے دوچار آئینہ

...مست اُس کی سے ہے اب تو دوچار آئینہ — آخر ان باتوں کا کھینچے گا خمار آئینہ

...د کرتا ہے، ترا عکس دکھا کر، بے تاب — اب تو پردے ہی میں کھیلے ہے شکار آئینہ

...مج : مجکو

حیرتِ حسن نے اُس شوخ کی، مارا ہے جسے　　اُس کا لازم ہے کریں لوحِ مزار آئینہ

گر اسی طرح کرے کشتۂ حیرت اپنا (ق) دم بہ دم مجھ کو دکھا کر رُخِ یار آئینہ

پس یقیں ہے کہ ملک نامۂ اعمال کی جا　　لا مرے ہاتھ میں دیں روزِ شمار آئینہ

گر یہی اشک فشانی ہے، تو ہم آنکھوں سے　　کر دکھا دیں گے تجھے جیب و کنار آئینہ

مت اسے چار غزل کہہ، کہ صفائی سے بقا[1]

جسم پر ہے یلِ معنی کے یہ چار آئینہ[2]

چھپ کے نظروں سے، اِن آنکھوں کی فراموش کی راہ

اب جو آتا ہے کبھی دل میں تو وہ گوش کی راہ

آگے، جوں اشک وہ رہتا تھا سدا پہلو میں

کیوں اب اُس طفل نے گُم کی مری آغوش کی راہ

کیونکے پونچھے گا وہ آکر مرے آنسو ہیہات

کوچے سب اشک سے گِل ہیں، نہیں پاپوش کی راہ

بھر سفر نام جیوں گا ترا، تو راہ کٹے

یوں تو طے ہوگی نہ اس رہ روِ خاموش کی راہ

چھوڑ کر کوچۂ میخانہ، طرف مسجد کے

میں تو دیوانہ نہیں ہوں جو چلوں ہوش کی راہ

یوں تو آتا نہیں، اے کاش مرے گھر کوئی

پھیرے نشّے میں غلط اس بتِ مے نوش کی راہ

---

[1] ج: کہ صفا سے یہ بقا۔

[2] ج: جسم اوپر یلِ معنی کے ہے چار آئینہ۔

ڈس گئیں ہائے مرے دل کے تئیں آج بقا
ناگنیں زلف کی اُس سر سے اُتر، دوش کی راہ

جام، دلِ بادہ کشاں ہے شیشہ
محتسب آج کدھر جام، کہاں ہے شیشہ

اقی میں جو آواز نہیں قلقل کی
اِس قدر آج یہ کیوں پنبہ دہاں ہے شیشہ

ب سنگ لیے ہاتھ میں اور سوے فلک
دم بہ دم چشم دہن سے نگراں ہے شیشہ

ھتا ہی نہیں ناز سے بالاے زمیں
کف بہ کف بزم میں ساقی کی رواں ہے شیشہ

ہے تراوش میں بقا اِسؔ سے مےِ نابِ سخن
ہے بجا کہیے اگر، اپنا دہاں ہے شیشہ

ہوا ایسا رخ سے خطِ جانانہ
تھا یارِ چمن گویا یہ سبزۂ بیگانہ

جو مرے گھر تم، کی راہ غلط کیدھر
بے وجہ نہیں پیارے بھولے ہو رہِ خانہ

سبِ ناداں جوں تاک نہ اینڈ اتنا
کھا جائے گا کیا مجھ کو، انگور ہوں بیدانہ

جوائے گل رو، بلبل ہوں، تو پھر ہر شب
ہوتا ہوں فدا تجھ پر جوں شمع پہ پروانہ

وں جگر کا خوں میں تو بہ شکن، زاہد
اس بزم میں بے ساقی پیمان ہے پیمانہ

لف میں ہر لحظہ چھیڑ اس دلِ خونیں کو
کرتا ہے حنابندی انگشت میں اب شانہ

دیوے جو بقا بوسہ وہ شوخ دمِ آخر
تو آبِ بقا سے ہو پُر عمر کا پیمانہ

خ : اپنی۔

ں : پیوند ہوا رخ سے ایسا۔

ہر لختِ دل آنکھوں میں مژگاں سے ہے پیوستہ ــــ اس ابرِ بہاری سے ہر خار ہے گلدستہ
ان سنگدلوں کے اب ہاتھوں سے بچوں کیونکر ــــ میں باغِ محبت میں ہوں بلبلِ پربستہ

از بس ہوں بقاؔ شائق اُس مطلعِ ابرو کا
آہِ سحری میری، ہے مطلعِ برجستہ

جب سے خاتم ہے تری زیرِ نگینِ آئنہ ــــ روکشِ ملکِ سلیماں ہے زمینِ آئنہ
چڑھ کے مُنہ پر تیرے، یہ خجلت سے رویا ہے کہ یار ــــ ہے پُر از اشکِ ندامت آستینِ آئنہ
صید کرنے کو مرے صیاد کے کچھ ان دنوں ــــ عکس نے بے وجہ پکڑی ہے کمینِ آئنہ
دل کو ظاہر بیں کے کب آوے کسی پر اعتقاد ــــ صورتِ نادیدہ کیا ہو دل نشینِ آئنہ
سرنوشت اخفا ہی بہتر، ورنہ کورو سدنی (کذا) ــــ گر عیاں جوہر سے ہو خطِّ جبینِ آئنہ
صاف دل سمجھے ہیں الٹی قدرِ ہر پست و بلند ــــ گر زمیں گردوں ہے تو گردوں زمینِ آئنہ
پا رکابِ عشق میں رکھ خود وہ ہو بیٹھا سوار ــــ توسنِ حیرت جو پایا زیرِ زینِ آئنہ
خود نمائی، عیبِ خود بینی سے ہے معیوب تر ــــ کاش خود بینا ہو روے خود مبینِ آئنہ
دیکھیے کن آنکھوں سے وہ دل ہائے حیراں کو خموش ــــ جو سنے نت توڑ کر آہِ حزینِ آئنہ
مت دکھا چہرہ تو اپنا اس کو اے خورشید رو ــــ پھونک دے گی خلق آہِ آتشینِ آئنہ
چاشنی گر خدا بینی ہو تو ہرگز نہ پائے (کذا) ــــ جوں مگس خود بیں بہ دامِ انگبینِ آئنہ
یوں ملی یہ مشتِ خاک اُس آبِ گوہر سے کہ جوں ــــ طین ہے اب آئنہ اور آب طینِ آئنہ
خود نمائے چشم بیں وہ شوخ تو خود بیں یہ دل ــــ واں ہے جلوت میں تو یاں خلوت گزینِ آئنہ
پردہ اُٹھنے پر بھی اُٹھا ہی رہے جیسا کہ ہے (کذا) ــــ ہو شے جس دل کا یقین مثلِ یقینِ آئنہ

کنزِ (مخفی) کیوں نہ سمجھیں ہم بقاؔ اپنی ہی ذات
کھل چکا ہے اپنی نظروں پر دفینِ آئنہ

ے گم ہوں، ضعیفی سے میرا حال ہے یہ　　جو کچھ تو دیکھے ہے پیارے، ترا خیال ہے یہ

یار نہیں زلفِ پریشاں کے تلے　　ہے نہاں صبحِ وطن، شامِ غریباں کے تلے

ں، سینہ جو ناصح سے چھپاتے نہ پھریں　　داغ سے داغ ہیں کچھ اپنے گریباں کے تلے

رق جو سینے میں چمکتی دیکھی　　طفلِ اشک آ ہی چھپے دامنِ مژگاں کے تلے

آتا ہے، کروں، اے گلِ خنداں تجھ بن　　بیٹھ کر گریہ، کسی نخلِ گلستاں کے تلے

اں داغِ جگر آہ سے رکھتا ہوں کہ جوں　　بادِ سے شمع چھپاوے کوئی داماں کے تلے

ڈرتا ہوں، کہیں بیٹھ نہ جاوے یہ کنواں　　مت کھڑا ہو تو عصا رکھ کے زنخداں کے تلے

نہیں ملنے کی بقا ہم کو بجز کنجِ مزار
جائے آسودگی، اِس گنبدِ گرداں کے تلے

چمن میں جا، گلوں کے رُخ سے رنگ اُڑ جائیں گے

روے دے نادیدہ گل سب بید رنگ اُڑ جائیں گے

اے گل چیں، چمن میں آشیاں کا خار و خس

آ ترے ہاتھوں سے اک دن ہم بہ تنگ، اُڑ جائیں گے

رق سے اُڑے تم، تو تمھارے ساتھ شیخ

ہم بھی چرخِ ہشتمیں تک، پی کے بنگ، اُڑ جائیں گے

: کیا کروں سینہ جو ناصح سے چھپائے نہ پھروں۔

: میرے۔　　۳ے ش، ک، سخ: آن چھپے۔

: مراد۔

ہے یہی دورِ فلاخن طور، تو اہلِ وقار
سب کے سب گردش میں آ کر مثلِ سنگ اُڑ جائیں گے

شب تو آوے گا مری مجلس میں، تو اے رشکِ صبح
شمع ہو جاویں گی گُل، اور سب پتنگ اُڑ جائیں گے

مت اکیلا سو، کہ عاشق ہیں ترے جنّ و پری
لے کسی شب خواب میں تیرا پلنگ اُڑ جائیں گے

غیر نے قاصد نہ کر بھیجا ہمیں تجھ تک، کہ یہ
دست شل ہیں، لے کے خط بابائے لنگ اُڑ جائیں گے

مجمعِ زہّاد ہے، پر رند کوئی سنگ سا
آ پڑا ان میں، تو سب مثلِ کلنگ اُڑ جائیں گے

خواب سے کھل چٹکیاں مژگاں کی اے ابرو کماں
غمزے تیرے صیدِ دل کو جوں خدنگ اُڑ جائیں گے

یہ تپش ہے تو بھتا بانالۂ آتش فشاں
ہم کسی شب چرخ پر مانندِ چنگ اُڑ جائیں گے

سیر میں تیری ہے بلبل، بوستاں بے کار ہے
بوستاں غیرت سے خود اُجڑا، خزاں بے کار ہے

چھوڑ کر آنسو کو، لختِ دل گیا ہمراہِ آہ
ناو خشکی میں چلی، آبِ رواں بے کار ہے

گہ زمیں سے بام پر ہوں، بام سے گہ بر زمیں
اس تپش سے، اپنے گھر کی نردباں بے کار ہے

ب فصلِ گل، اور مجھ عندلیبِ زار کا
ہے نشیمن شاخِ گل پر، آشیاں بے کار ہے

ے اور ہم سے، محفل میں، بچا کر چشمِ غیر
ہے سخن ایما ہیں باہم، اور زباں بے کار ہے

ڈر سے تونے بٹھلایا تھا در پر پاسباں
سو میں حسرت سے موا، اب پاسباں بے کار ہے

ارے ہے چشم اُس کی، معطّل ہے قضا
فتنہ ہے اُس کی نگہ میں، آسماں بے کار ہے

ہوں بوسہ میں جس دم، تو اُس دم یار کے
کار ہیں لب پر نہیں ہے، دل میں ہاں بے کار ہے

ربا دیکھ کر غیروں پہ، میں اُس سے کہا
کار ہے مجھ سے بھی کچھ؟ بولا کہ ہاں، بے کار ہے

اے بقائے کارداں، اس ریختے کی ہر ردیف
گرچہ ہے بے کار، پر بتلا، کہاں بے کار ہے

اں دبیں جو سرِ انگشت کے تلے	جاویں بہ رنگِ مورمر، انگشت کے تلے
اے طبیبِ صبا دیکھ نبضِ گل[a]	بلبل کا دل ہے تیری ہر انگشت کے تلے
م جلوں کی راکھ دباتے ہو ہاتھ سے	آجائے گا کوئی شرر انگشت کے تلے
شم، ہجر میں، اُٹھتا ہوں خواب سے	ٹوٹے ہیں اشک کے گہر انگشت کے تلے

: رہیں۔ ۵۲ س: کو۔

کرتا ہے ہاتھ سے ہمیں صیاد کب رہا ‎ ‎ جب تک نہ لیوے داب پر انگشت کے تلے

روتا ہے کیوں طبیب، مگر آج اپنی نبض ‎ ‎ دیتی ہے مرگ کی خبر انگشت کے تلے

وہ طفل، نام عشق کا، آہستہ شرم سے ‎ ‎ پڑھتا ہے حرف ڈھانک کر انگشت کے تلے

پھاہا جو تو لگاوے کبھی میرے داغ پر ‎ ‎ مرہم نہیں کرے اثر انگشت کے تلے

مطرب کا تارِ بین نہ سمجھو بقا کہ یہ
ہے نغمہ زا رگِ جگر انگشت کے تلے

سپاہِ عشرت پہ فوجِ غم نے جو دل کے مرکب بہم اُٹھائے
اُدھر تو نالے کا تاشا کڑکا، اِدھر فغاں نے علم اُٹھائے

اس اشک و لختِ جگر سے ایک ہی فقط نہ مردم کو فائدہ ہے
جو دُر کے رولے عدو کسی نے، تو لعل کے بھی رقم اُٹھائے

سبب رقیبوں کے، بزم میں اب، گئی وہ آپس کی ہم نشینی
ہم آن بیٹھے تو اُٹھ گیا وہ، وہ آن بیٹھا تو ہم اُٹھ آئے

تہی کف آئے تھے ہم عدم سے، چلے بھی[1] یاں سے تو دست خالی
نہ توشہ[2] واں سے لیا[3] تھا زر کا، نہ ساتھ یاں سے درم اُٹھائے

بقا جو راہی ہوئے عدم کے، تو وقفہ ہرگز کرو نہ دم کا
یہ راہ ہستی کی پُر خطر ہے، چلو یہاں سے قدم اُٹھائے

---

[1] گ: چلے یہاں سے ‎ ‎ [3] گ: یہاں تھا آیا

[2] س: نہ توشہ واں سے یہاں تھا آیا۔

...ہرے کی جب طرح رقم ہاتھ سے رکھ دی — کانوں پہ مصور نے قلم ہاتھ سے رکھ دی

...پہ تیغ اُس نے تو کھینچی تھی، ولیکن — سمجھا کہ یہ ہے سیدِ حرم، ہاتھ سے رکھ دی

...مرے مے، مری توبہ شکنی کو — ساقی نے دلا اپنی قسم، ہاتھ سے رکھ دی

نذر اُس نے بقا پہلے مرے دل کی اُٹھا لی
پر لے کے کیا پھر یہ ستم، ہاتھ سے رکھ دی

...عشق میں اب عیش و غم برابر ہے — بہ رنگِ سایہ، وجود و عدم برابر ہے

...ہے عیش سے بالیدگی، نہ غم سے گداز — ہمارے کام میں سب نوش و سم برابر ہے

...ہے قافلہ، پہ ہم سے ناتوانوں کو — ہزار گام سے اب اک قدم برابر ہے

...مردمِ روشن ضمیر، گر پوچھو — تو قدرِ جامِ مے و جامِ جم برابر ہے

...س کے روز جو دیکھا تو عندلیبوں کو — صفیرِ بوم سے اب زیر و بم برابر ہے

...شگفتہ ہیں گلشن میں گرچہ لالہ و گل — تمھارے چہرے سے پہ کوئی کم برابر ہے

...دے گئے لقمہ تجھے تو عذر نہ مان (؟) — ترا تو شیخ تنور و شکم برابر ہے

...تِ ناز و ادا، جس کو روزِ وعدے کے — شکستِ جام و شکستِ قسم برابر ہے

بقا جو بار نہ دے ہم کو اپنی محفل میں
تو مرگ و زندگی اپنی بہم برابر ہے

...ٹک باغ میں، قمری! جو وہ شمشاد کرے — مول لے کر ترے اِس سرو کو آزاد کرے

...و بنیادِ جنوں تھی قدمِ مجنوں تک — کون اب خانۂ زنجیر کو آباد کرے

...مج : جامِ گل۔

یہی کاہش ہے جو غم سے تو پس از مرگ وہ شوخ
خاک بھی میری نہ پائے گا کہ برباد کرے

درسِ الفت میں ہے اُس زلف کا ہم سے یہ سلوک
طفلِ مکتب سے جو کچھ سیلیِ اُستاد کرے

رشدِ باطن کی طلب ہے تو کر اے شیخ وہ کام
پیرِ مے خانہ جو ظاہر میں کچھ ارشاد کرے

غیر بے رحم یہ کچھ، یار سو وہ پنبہ بہ گوش
آگے اب کس کے بقاؔ نالہ و فریاد کرے

خواب میں جب نظر آیا رخِ دلدار مجھے
طالعِ بد نے کیا رشک سے بیدار مجھے

کھول کر چشم جو دیکھا تو تہی ہے آغوش
وہیں حیرت نے کیا صورتِ دیوار مجھے

کیا کرے بخت جو اپنے ہیں نہ موے اندام (کذا)
ہو کے سب دشمنِ جاں دیتے ہیں آزار مجھے

پہنچوں اس چشم تلک پر یہی جو کبھی (کذا)
زیرِ شمشیر ملے ابروے خمدار مجھے

چشمِ ساغر کی طرح یادِ لبِ ساقی میں
روز و شب اب تو ہے گریے سے سروکار مجھے

ہوں میں اُس چشم کے ہاتھوں سے بقاؔ سر بکام
رہے کس طرح بھلا طاقتِ گفتار مجھے

انگشتریِ چشم ہے کس کام کے لیے
ہر لختِ دل نگیں ہو مگر کام کے لیے

دیکھا تو زیرِ قصرِ فلک دارِ خلق میں
ہرگز مکاں نہیں کوئی آرام کے لیے

اے عندلیب باغ میں صیّادِ دہر کو
منظور پرورش ہے تری دام کے لیے

پھر دور دور، مت ہو گنہ گارِ عشقِ گل
فرصت نہیں ہے دیدِ دل آرام کے لیے

سوداؔ کی طرح حیف بقاؔ آ جہان میں
کیا کر چلے اور آئے تھے کس کام کے لیے

عشق میں جو ہے کبریائی کی	عاشقی جس نے کی، خدائی کی
ہمسری مت صبا سے کر اے آہ	تو نے بھی کچھ گرہ کشائی کی
لے چلے ہم قفس سے اے صیاد	خاک میں آرزو رہائی کی
روز محشر تلک نہ آخر ہوں	داستانیں شبِ جدائی کی
شیخ جیو سے ہوئی نہ سرزد باو	چول بولی ہے چارپائی کی
جس میں یارانِ بزم ہوں محظوظ	یوں بقا میں غزل سرائی کی

میر بھی ورنہ خوب کہتے ہیں
کاٹیے جیب اُن کی دائی کی

ی چشم میں کیوں نہ خوناب اُترے	کہ دریا میں البتہ[۱] سرخاب اترے
تجھ کو کرے سروِ آزاد قمری	نہ گردن سے یہ طوقِ سنجاب اترے
اں، چشم سے دل میں، ہمراہ لے کر	جگر خون کرنے کا اسباب، اترے
ئی موج بھی تا بہ گردن نہ گزری	یہ دریا کئی بار پایاب اترے
عاعِ رخ اُس کی چڑھی یوں فلک پر	کہ جوں خاک پر نورِ مہتاب اترے

بقا اور اک جام ساقی سے لے[۲] لو
کہ سر سے خمارِ مےِ ناب اترے

ں مے کدے کی جانب آہنگِ محتسب ہے
در پیش مے کشوں کو پھر جنگِ محتسب ہے

---

۱ شع : کہ البتہ دریا میں	۲ مج : لے تو

ہوتا ہے شیشۂ دل چور اُس کی گفتگو سے
یارب! یہ پندِ ناصح یا سنگِ محتسب ہے
منہ سرخ ہو رہا ہے بیمِ معناں سے اُس کا
جو کچھ ہے رنگِ مینا، سو رنگِ محتسب ہے
از بس گراں ہے اُس پر مینائے مے کی قلقل
پڑھنا بھی چار قُل کا اب ننگِ محتسب ہے
ہرگز بقا نہ رہیو دورِ فلک سے غافل
مستوں کی نت کمیں میں سرِ جنگِ محتسب ہے

جاؤں گا چمن میں دلِ نالاں کو بھی لے
واں نالۂ بلبل کا ٹک اک راگ تو جم لے
تسخیر کو جاتی ہیں جدھر اشک کی فوجیں
نکلی ہے اُدھر آہ بھی کاندھے پہ علم لے
ہے گریۂ بلبل پہ ترحّم اُسے، ورنہ
چاہے تو ابھی گل سے وہ ہنسنے کی قسم لے
بس یارے جنوں، سیرِ بیاباں تو بہت کی
اب خانۂ زنجیر میں ٹک بیٹھ کے دم لے
افسوس کہ ہم رشک سے ہوں خاک برابر
اور بوسہ کفِ پا کا ترے نقشِ قدم لے
یہ ریختہ جس دن سے بن آیا ہے بقا خوب
یاروں نے تو کیا کیا نہ کیے تیرلے حملے (کذا)
الفاظ و معانی میں رہے رخنہ فگن یوں
جس طرح کہ گلبرگ کے تئیں ....

اے مریضِ محبت کی نبض چھوٹ گئی
ٹک اک جو آس تھی جینے کی، آج ٹوٹ گئی

حالِ مرا دیکھ کر، گجر بجتے — شب فراق بھی چھاتی کو اپنی کوٹ گئی

بقا، یہ گریہ نہاں کب تلک رقیبوں سے
ستم ہے حق میں ترے گریہ بات پھوٹ گئی

دل اب تو جوں شبنم بندھا ہے گل کے پلّے سے
ڈرا مت مجھ کو اے بلبل تو اتنا اپنے گلّے سے

ہے خوں مرے دل کو حنا کی سادہ کاری نے
بنھائے پور پور آخر مرے ہاتھوں میں چھلّے سے

ستِ دل پہ رندوں کی، عبث تو شیخ مرتا ہے
کوئی یہ قلعۂ روئیں ترے ٹوٹیں گے ہلّے سے

پچنے دے کوئی دانہ، نکالے چیر کر پہلو
بھرے بھی آسیا کا منہ کبھی گردوں جو غلّے سے

بقا خاموش رہتا ہے، جو کھینچے ایک بھی نالہ
تو ننگے پانو ہمسایے نکل بھاگیں محلّے سے

س میں ہم مس سے بتر ہو چکے — لیک اُسی مس سے کہ زر ہو چکے
خ کو ترے شب سے میں تشبیہ دوں — پر اُسی شب سے کہ سحر ہو چکے
رہ ترا ہے مہِ نو اے صنم — پر وہ مہِ نو کہ قمر ہو چکے
ک گلِ سیب ہے تیرا زنخ — لیک وہی گل کہ ثمر ہو چکے

قطرۂ نیساں ہیں وہ دنداں بقا
پر وہی قطرہ کہ گہر ہو چکے

دل سے وہ نگاہ پیر گزری — پر شکر کہ جی کی خیر گزری

کیا فصلِ بہار کیا خزاں میں — اِس باغ کی کرتے سیر گزری

محفل میں بتا تو کس طرح سے — اغیار سے ہم بغیر گزری

جیتی ہوئی ہم سے مہر سرزد — اُتنی تمھیں کرتے بیر گزری

جانا ہی بقا بھلا تھا دل کا

کچھ تیری اِسی میں خیر گزری

ہاں میاں سچ ہے، تمھاری تو بلا ہی جانے

جو گزرتی ہے مرے دل پہ، خدا ہی جانے

دل سے نکلے کہیں پابوسیِ قاتل کی ہوس

کاش وہ خوں کو مرے رنگِ حنا ہی جانے

دل کی واشد پہ عبث آہ نے کھینچی تکلیف

کھولنے عقدے تو غنچوں کے صبا ہی جانے

روز و شب نزع میں ہے عاشقِ چشم و لبِ یار

نہ تو جینا ہی وہ سمجھے، نہ فنا ہی جانے

ہم تو نت دور سے خمیازہ کشِ حسرت ہیں

لذّتِ بوس و کنار اُس کی حیا ہی جانے

تیرے بیمار کو کیا ہوئے شفا، جس کے طبیب

نہ تو کچھ درد کو سمجھے، نہ دوا ہی جانے

اس دل سے جو ہے کاٹ ترے ابرو کا
جوہرِ بُرّشِ شمشیر سپاہی جانے

مرضی تو یہ ہے بندۂ بت ہو رہیے
آگے مرضی (ہے) خدا کی، سو خدا ہی جانے

طور پر اپنے سخن کون بُرا کہتا ہے
پر یہ انداز جو پوچھو تو بقا ہی جانے

کہاں تاب، جو نالے میں کروں شوروں سے
سانس بھی آتی ہے لب پر تو بڑے زوروں سے

احوال تو ٹک اپنے تو بیماروں کا
مُردے گویا کہ اُٹھ آئے ہیں ابھی گوروں سے

ے ضعیفوں کا پئے بوسہ ترے لب پہ ہجوم (؟)
حق تعالیٰ ہی بچاوے یہ شکر موروں سے

شکّرِ بوسۂ لب ہم کو نہ دے کیا طاقت
تاب ہے گل کی جو منہ موڑے شکرخوروں سے (؟)

ب ہوس ہوتی ہے فندق کی تو ملتے ہیں بتاں
مثلِ عنّاب مرے لختِ جگر پوروں سے

خط چڑھ گئے سب اُس کے فرنگِ رخ پر
فوج کالوں کی جُٹی آن کے اب گوروں سے

ے مج۔

دل دوں کس طرح بقا ہاتھ میں اُس غافل کے
کف میں جو رنگِ حنا رکھ نہ سکے چوروں سے

آ کے ناصح جو مرا لبسِ دریدہ کاڑھے
تو سوئی لے کے وہ بھڑوا ابھی کشیدہ کاڑھے

تو نہاتا ہے جو دریا میں، تو آنکھوں کو تری
بیٹھے تکتے ہیں صدف آب سے دیدہ کاڑھے

تجھ سے خوبی میں ہوں ہمسر تو مہ و مہر کو کیوں
گوش و بینی نہ فلک کر کے بریدہ کاڑھے

گل ہو پژمردہ تجھے دیکھ کے، تو تیرے لیے
پھر کہاں سے وہ بھلا رنگِ پریدہ کاڑھے

دل نکالوں گا ذقن سے تری یوں با قدِ خم
چاہ سے دلو کو جوں کوئی خمیدہ کاڑھے

مجھ کو شانے سے خطر ہے کہ پکڑ زلفوں سے
دل کو میرے نہ یہ اب دست بریدہ کاڑھے

دیکھوں اُس مہر کو گلشن میں تو عطسہ وہ ہیں
گل کی آ سر سے مرے بوئے شمیدہ کاڑھے

پھر مشیخت کی بھلا کیونکے لگا وے ٹکی
شیخ گر ریش سے اپنی نہ رفیدہ کاڑھے

یادِ لب میں ترے یوں ہونٹوں پہ لاتا ہوں میں جھاگ
منہ سے کف جیسے کوئی مارگزیدہ کاڑھے

صیتِ اشعار تری خلق سے تب کم ہو بقا
جب کہ گوشوں سے کوئی حرفِ شنیدہ کاڑھے

کہتا ہے دم بوسہ، چل دور کہاں کا ہے
لے ہم سے، ترا ایسا مقدور کہاں کا ہے

دکھ درد جو پھر کوئی تم حضرتِ دل لائے
یہ حصہ بخت اپنا بھر پور کہاں کا ہے

ہنستا ہے جو تو اپنے کمر در ضعیفوں پہ مر
انبار میں تو ایسا شہ زور کہاں کا ہے

ہیں دوست مرے لاکھوں، پر ہائے نہ ناصح سے
یہ دوست خدا جانے آخور کہاں کا ہے

سن غیب سے پردے سے آہ اُس کے ضعیفوں کی
حضار کو ہے حیرت یہ شور کہاں کا ہے

ور کے جلوں کا جو کافورِ کفن ہووے — یہ ماہِ خنک پرتو کافور کہاں کا ہے

م نگہ پرلے، جاں مانگے ہے دستوری — دستوریِ جاں ظالم دستور کہاں کا ہے

ں ہے مسیحا بھی کچھ روگ میں اس دل کے — کیا جانیے یہ روگی رنجور کہاں کا ہے

یں ترے ساقی، ہے زخمِ جگر کی بو — یہ جس سے چوا ہے وہ انگور کہاں کا ہے

دل پہ کہ ہر ساعت اک تازہ تجلّی ہے — کیا جانے اسے موسیٰ، یہ طور کہاں کا ہے

ذکر مرا چھیڑے کوئی، تو وہ کہتا ہے — جانے دو یہ اے صاحب مذکور کہاں کا ہے

فریادِ جگر تیری ہے سخت بقا دل کش
یہ زیرِ بغل تیرے طنبور کہاں کا ہے

ت میں میری آہ سے یہ زلزلے ہوئے — طبقے زمیں کے جس سے کہ اوپر تلے ہوئے

ی تغافلوں سے ترے، موسمِ بہار — سینے ہیں مثلِ تاک ہمارے پھلے ہوئے

ل لیے تھے زلف نے منہ مانگی شرط پر — سو دل پڑے ہیں پانو کے نیچے ملے ہوئے

ں آہِ آتشیں کہ اب اُس در پہ دادخواہ — لے کر چلے ہیں نعش پہ مردے جلے ہوئے (کذا)

...... — پھیرے ہے راہ سے مری قاصد چلے ہوئے

ا ہے اب تو ہو کے یہ اڑیل، نہ جائے گا — چھاتی پہ میری مونگ یہ غم بن دلے ہوئے

یا تھا بس کہ یہ دل آنکھوں سے شمع وار — آنسو جو کچھ بہے تھے سو جم کر ڈلے ہوئے

ے اور کی ہوس میں تو عاشق ہی سب برے — اب تیری رہ روی میں تو عاشق بھلے ہوئے

رے نمے جو رشک سے شب بزمِ مے میں یار (ق) — تھے دلبران و دلشدگاں سب جلے ہوئے

عیں عرق ہو شرم سے ہوتی تھیں سیلِ مے — پروانے سب کباب تھے گھر کے تلے ہوئے

ہتہ کر گئے تھے کوچۂ قاتل میں ہم بقا (کذا)
آئے نہ خاک و خوں میں وہاں سے رلے ہوئے

جس[1] کو کہتے ہیں یہ رہ رو جرسِ محمل ہے — محنتِ راہ سے نالاں وہ[2] ہمارا دل ہے

موج سے بیش نہیں ہستیِ وہمی کی نمود — صفحۂ دہر پہ گویا یہ خطِ باطل ہے

کچھ تعیّن[3] نہیں اس راہ میں جوں ریگِ رواں — جس جگہ بیٹھ گئے، اپنی[4] وہی منزل ہے

آستیں حشر کے دن خوں[5] سے بھری ہو جس کی — یہ یقیں جانیو اُس کو کہ مرا قاتل ہے

کھول دو عقدۂ کونین بقا کے پل میں
یا علی تم کو یہ آسان[6]، اُسے مشکل ہے

جدا کرنا ہو سر میرا جو ہر تقدیر گردن سے — تو یوں مل مل کے پھر جاوے نہ وہ شمشیر گردن سے

جدا سر ہو گیا تن سے تو شمع آسا خموشی میں — کریں گے سوزِ دل اپنے کی ہم تقریر گردن سے

جو دیکھیں خواب میں شب کو تری شمشیر اے قاتل — تو پوچھیں صبح ہم دیوانگاں تعبیر گردن سے

مسخّر طرۂ شمشاد کی ایسی ہے گر تم ری — تو اُترے گا نہ اس کی حلقۂ تسخیر گردن سے

قلم کا سر قلم کرتا ہوں میں اب خط کے پردے میں
کرے تو اک غزل ایسی یہ پھر تحریر گردن سے

نہ گزرا تھا ہنوز اُس کی دمِ شمشیر گردن سے — کہ ہاتھ اے یار دھو بیٹھا ترا نخچیر گردن سے

---

[1] ہ، گ، د، ج: رہ رواں کہتے ہیں جس کو۔ س: جس کو کہتے ہیں مسافر۔

[2] ج: یہ۔

[3] گ: تعلق۔ مج: تیقّن۔

[4] س: آہ وہی۔ [5] ہ، گ، د، ج: خون سے تر ہو جس کی۔

اے کوہکن یاں تک ہوا تھا خونِ خسرو کا
کہ بہتی اُس کے وقتِ ذبح جوئے شیر گردن سے

وش گر مجنوں ہیں اپنے ورنہ کس خاطر
رکھیں پیوستہ کاکل کی سدا زنجیر گردن سے

ہوں شمع ساں، دامنِ ملامت کھینچ اے ناصح
گریباں سر کو لے اُترے گا جوں گلگیر گردن سے

تا اس مسی آلودہ لب سے نیلوفر دعویٰ
گزرتی اس کی موجِ آب جوں شمشیر گردن سے

جوں خامہ سر، تو کیا ہے، نامہ اپنے قاتل کو
کریں گے شکلِ بے سر خامہ، ہم تحریر گردن سے

ں رعشہ سرِ زاہد ہیں، ہر دم مرگ کو اپنی
اشاروں میں بلاتا ہے یہ مردِ پیر گردن سے

قسم معصومِ دشتِ کربلا کی، یہ وہ دورہ ہے
بقاؔ گر مانگیے پانی، تو گزرے تیر گردن سے

م اور صبح اور گلنار خنداں ہو کے مل بیٹھے
تو ہم بھی اُن میں باچاکِ گریباں ہو کے مل بیٹھے

یں گھُلتے جو لوں اُس شہد لب سے بوسۂ ثانی
یہ لب یوں بوسۂ اوّل میں چسپاں ہو کے مل بیٹھے

ادوں دھجیاں دل کی اگر ان میں سے کوئی بھی
قبائے سرخ میں تیری گریباں ہو کے مل بیٹھے

جزوِ ہمدگر ہیں اے کماں ابرو، عجب مت کر
جو دل تیرے سرِ ناوک پہ پیکاں ہو کے مل بیٹھے

ھی دل جمع ہے، اے شانہ کر جلدی سراغ اس کا
مبادا اُس زلفِ مشکیں میں پریشاں ہو کے مل بیٹھے

نا اے طفل جب مژدہ تری مکتب نشینی کا
یہ اجزائے دلِ سیپارہ قرآں ہو کے مل بیٹھے

ہمارا رشک سے دل جل کے خاکستر ہو، یا قسمت
اور ان داموں میں مسّی زیبِ دنداں ہو کے مل بیٹھے

یہ وہ مجمع نہیں ناصح جہاں ہو دخل دانا کو
مگر تجھ سا کوئی مکّار، ناداں ہو کے مل بیٹھے

یہ انساں زاد پری وش ایسے دل کش ہیں کہ بے وحشت
پری آوے اگر ان میں، تو انساں ہو کے مل بیٹھے

یہ اطفالِ حسیں عاشق کا جی لینے میں شیطاں ہیں
جیے عاشق وہی ان میں جو شیطاں ہو کے مل بیٹھے

بقاؔ ہم گبرِ نامسلم تھے پر آکر بہ ناچاری
وہ مسلم زادہ طفلوں میں مسلماں ہو کے مل بیٹھے

تھے ہم استادہ ترے در پہ، ولے بیٹھ گئے
تو نے چاہا تھا کہ ٹالے، نہ ٹلے، بیٹھ گئے

بزم میں شیخ جی اب ہے کہ ہے یاں عیب نہیں (کذا)
فرش پہ گر نہ ملی جا، تو تلے بیٹھ گئے

غیر بد وضع ہیں، محفل سے شتاب اُن کی اُٹھو
پاس ایسوں کے تم اے جان بھلے بیٹھ گئے

گھر سے نکلا نہ تو، اور منتظروں نے تیرے
در پہ نالے کیے یاں تک[1] کہ گلے بیٹھ گئے

ناتواں ہم ہوئے یاں تک[2] کہ تری محفل تک
گھر سے[3] آتے ہوئے، سو بار، چلے، بیٹھ گئے

اشک اور آہ کی شدّت نہ تھمی[4]، گرچہ بقاؔ
گھر کے گھر اس میں ہزاروں کے جلے، بیٹھ گئے

---

[1] س: اتنے۔ [2] گ، مج، س، ج: اتنے۔

جو خالِ سیہ لب پہ آشکارا ہے — کسی کے بختِ سیہ کا مگر ستارا ہے

ں لالہ نہیں، تجھ کو دیکھ کر قاتل — زمیں سے خونِ شہیداں نے جوش مارا ہے

ت بارِ دلِ مضطرب اُٹھا نہ سکے — یہ قطرہ خوں جسے دل کہتے ہیں گے پارا ہے

ے عیش نہیں، جب سے ہجر میں تیرے — الم کو قول دیا، غم سے ہاتھ مارا ہے

دیا ہے جواب اضطراب نے اس کو — کبھی جو صبر درِ دل پہ آ پکارا ہے

بقاؔ کی آہ نے اُس میں کبھی نہ کی تاثیر
بتاں! یہ دل ہے تمھارا کہ سنگِ خارا ہے

نفق و مہرباں ہے تو تو ہے — بلائے دل، آشوبِ جاں ہے تو تو ہے

ں پر چڑھا مجھ کو اے نشّۂ مے — کہ اس بام کی نردباں ہے تو تو ہے

سرت ہوا ے داغ چھاتی سے میری — گئے دل کا اب اک نشاں ہے تو تو ہے

ں تڑپے ہے یہ کس[۳] ابروے خمدار کی — آج کچھ ناخن بہ دل ہے آہ اس بیمار کی

ج اُس کا صفا تیرے کفِ پا کی نہ پاوے — خورشید ہزار اپنے تئیں چرخ چڑھاوے

حسرت مری جانب کمانِ یار سے — دیکھتا پیچھے کو آیا دیدۂ سوفار سے

رج۔ — ۲ م، ع: تڑپے ہے دل۔

ز، ش، شع: اُس۔

ہ: رخ اُس کا صفائی ترے تلووں کی۔ د، ل، ش، ک، ن: صفائی ترے تلوے کی۔

گریے سے بعدِ مرگ یہ طغیانِ آب ہے گنبد مرے مزار کا مثلِ حباب ہے

خوں جگر میں نہ رہا، گریے کے کرتے کرتے ہو گیا شیشہ تہی جام کے بھرتے بھر

آکر بہ زیرِ مژگاں یوں دل کا لخت دم لے جوں آن کر مسافر زیرِ درخت دم

سخن کی آب افزوں ہو جو اہلِ ہوش تک پہنچے
گہر ہووے وہ قطرہ جو صدف کے گوش تک پہنچے

ہم آکر مر گئے ظالم تری دہلیز پر، ڈر کے موئے افسوس کس جاگہ، ہوئے گھر کے نہ با

نہ گھر ملے، نہ تو باہر، نہ آستاں پہ ملے توہی بتا کہ ملے تو، تو کس مکاں پہ

ملی تھی دل میں اس ناوک کی بھال... سے خدا جانے ہوئی کا ہے سے بیدل....

ماہِ نو انجم کے عقدے کس طرح سے وا کرے ہوں جہاں لاکھوں گرہ، واں ایک ناخن ک

گیا تجھ کو لکھوں خط، حرکت ہاتھ سے گم ہے خامہ بھی مرے ہاتھ میں انگشتِ شش

دیدۂ تر[۱] چھٹ چواوے کون اس کے منہ میں آب
نزع کے دم گر ترا بیمار منہ کھولے رہے

گر دو گے بقا[۲] کو تم آ نزع کے دم بوسہ تو اُس کے تئیں گویا تم آبِ بقا دو گے

(نوٹ) مخطوطے میں ورق ۷ الف پر سب سے پہلے ایک رباعی ہے، جس پر یہ عنوان لکھا ہوا ہے، " رباعی ہجو میر تقی" ، لیکن یہ درحقیقت ۵ اشعار پر مشتمل قطعہ ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے :

عیب ہے گرچہ کثرتِ یک لفظ سخنِ فارسی سے تا ہندی

یہ قطعہ حصۂ ہجویات میں شامل ہے۔ اس قطعے کے نیچے ۴ متفرق شعر لکھے ہوئے ہیں۔ پہلے شعر پر بطور عنوان " ولہ " لکھا ہوا ہے، یہی صورت دوسرے شعر کی ہے البتہ اس کے بعد " ولہ میر تقی " لکھ کر دو شعر لکھے گئے ہیں۔ یہ چاروں شعر اسی طرح درج کیے جاتے ہیں۔ بقا سے ان اشعار کا انتساب محلِ نظر ہے ۔ اس لیے ان کو اصل متن میں شامل نہیں گیا گیا۔ یہ اشعار جس صورت سے لکھے ہوئے ہیں، اسی طرح نقل کیے جاتے ہیں۔ تصحیح سے کام نہیں لیا گیا۔

ولہ

یہ تو نہیں کہتا ہوں کہ سچ مچ کرو انصاف جھوٹی بھی تسلی ہو تو ضائع نہ ہوں میر

ولہ

بکل جو بھی جاتی تو سب یہ خلل جاتا نکلا ہی نہ جی ورنہ کانٹا سا نکل جاتا

---

۱ ؎ شع ۲ ؎ سخ

ولہ میر تقی

فرہاد ہاتھ تیشہ پہ پیچھے ہی ڈالتا   پتھر میں سر ہاتھ ہی اپنا نکالت

تھا مستعار حُسن سے اس کے جو نور تھا   خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرا طور تھ

رباعیات

و

قطعات

زاری کی نہ میری کچھ اُسے شرم ہوئی رونے سے نہ طبع اس کی کچھ نرم
ہر آہِ خنک بقا خنک تھی اس پر اب نالۂ گرم سے بہت گرم

رباعی تجنیس

یا کاش کہیں لگیں ٹھکانے مرہم یا کاش کہیں لگیں ٹھکانے مرہم
مرہم لگیں زخمِ دل پہ تا ہووے زیست یا کاش کہیں لگیں ٹھکانے مرہم

آتا ہے یہ دل میں عشق بازی کیجے اس دل کو کسی بت کا نمازی
چشم اُس کی بقا رام نہ ہووے، تو بھی اپنی سی غرض زمانہ سازی

اِس باغِ جہاں کے بیچ ہنگام بہار جتنے تھے درخت، میوہ لائے بر
امّیدِ ثمر میں ایک اپنا ہی بقا ہے دستِ تہی بلند مانندِ

در مذمّتِ نفس

گو ہم پئے دیں کفر تجیں بے کم و کاست چھوڑیں طلبِ حق میں بتاں کی
سو سال بقا زیرِ زمیں رکھیں دفن تو بھی نہ سگِ نفس کی دُم ہووے

آوارۂ وادیِ طلب کو افلاک ہر گاہ کریں جور و تعدّی
پیوندِ زمیں بھی کر کے آرام نہ دیں پھر شیشۂ ساعت میں بھریں اُس

صیّادِ ستم پیشہ و آزار دہا | کب ہم نے کہا بند سے کہ ہم کو رہا
مرنا تو مسلّم ہے، پر اس عرصے میں | ہو جائے جو سیرِ گُل میسّر، فبہا

عاشق ہوئے جب ترے، تبھی سے نہ بنی | اک ہم سے فقط نہیں، سبھی سے نہ بنی
امّیدِ کرم پہ کیا ترا کھینچیں جور | کب آگے بنی، اگر ابھی سے نہ بنی

چُبھتے ہیں جو غم کے خار پہلو پہلو | تڑپے ہے یہ بے قرار پہلو پہلو
اتنا بھی دبا نہ چل بقا کو اے عشق | اے اشترِ بے مہار، پہلو پہلو

۵

ع	ک دولت و جاہ ابدی ٹکا	ر
ماشیِ چرخ ہیں جوں اہل ۔ اس کے	ں ا ا م ا ر	مازتا غیر کو شہرت ہے اب اس کا
[illegible]	۱۲۲ الحنہ ابجم ہو ہ ہ ے لمہ ۃ	[illegible]

---

۵ مالکِ دولت و جاہِ ابدی ٹیکا رام | مازتا غیر کو شہرت (ہے) ہے اب اس کا نام
مانعِ ظلم ہے وہ عدل فزا صبح اور شام | ماشیِ چرخ ہیں جوں اہلِ (جہاں) اس کے غلام

تقی خاں	بدولت	امیر	معظم
بدولت	میان	خلائق	مکرّم
امیر	خلائق	معزّز	بدلہا
معظّم	مکرّم	بدلہا	مسلّم

واہ

له

مند ہے وہ ترا یار بے

عام میں جو وفا سے

نما

اقبال ق ا ب

ر

له اقبال مند ہے وہ ترا یار بے وفا
.... تو اب ہوا ہے ترا اس فلک رسا

افواہِ عام میں جو وفا سے ہے آشنا
اس رشکِ مہ سے کیوں نہیں ملتا تو اے بقا

لہ

بزم میں کب ہے تقی خاں کا کوئی اب ہمسر

رزم میں قتل پہ اعدا کے جو باندھے وہ کمر

ہم خود اس کی ہے داد و دہش درہم و زر

دم کرے بیم سے فوج ان کی بہ احوال بتر

لہ بزم میں کب ہے تقی خاں کا کوئی اب ہمسر ہم خود اس کی ہے داد و دہشِ درہم و زر
رزم میں قتل پہ اعدا کے جو باندھے وہ کمر دم کرے بیم سے فوج ان کی بہ احوالِ بتر

قصائد

جب مری چشم گئی نیند سے کل رات جھپک ۔۔۔ طالعِ خفتہ مرے جاگ اُٹھے لگتے ہی پلک

خواب میں آئی نظر مجھ کو وہ غیرتِ دہِ حور ۔۔۔ حور بھی دیکھ کے شاید جسے رہ جائے بھچک

عضو عضو اُس کا ہر اک خوبی و رعنائی میں ۔۔۔ ایک سے ایک زیادہ تھا جو کی غور تنک

مانگ وہ جادۂ ظلمت کہ سکندر جس میں ۔۔۔ جا کے یک چند رہا کور کی صورت سے بھٹک

نیچی کنگھی میں درخشاں تھی یہ کچھ وہ کافر (؟) ۔۔۔ جیسے تحریر کوئی زر کی ہو بالائے محک

من تو کالے کا وہیں دم میں دیا سا بجھ جائے ۔۔۔ دیکھے عارض پہ جو اس طرۂ مشکیں کی لٹک

عام تھا دورِ قد و زلف میں اس کے ورنہ ۔۔۔ شاخِ شمشاد پہ کونپل نہیں پھوٹی اب تک

جا چھپا زیرِ زمیں عہد میں اُس کاکل کے ۔۔۔ چھوڑ کالے کا برن خوف سے راجا باسک

خطِ ریحاں سے بنا جیوں کوئی جو تورا ۔۔۔ ڈھیلے پیچوں نے دیا یاں وہی گردن کو مرڑک دکن

لاف جب حسن سے مارے، تو کہے یوں وہ حسیں ۔۔۔ ہوں تو میں ماہِ زمیں، لیک بہ از ماہِ فلک

اُس جبینِ عرق افشاں سے تھی ابرو کی یہ دھج ۔۔۔ مینہ برسنے میں ہو جس طرح نمودار دھنک

کھل گئے پھر تو یکایک مری چھاتی کے کواڑ ۔۔۔ لگی دینے جو وہ مژگاں درِ دل پر دستک

بے گنہ قتل پہ مردم کے کرے تھی سرگرم ۔۔۔ چشم، اُس غمزۂ خوں خوار کو دے کر پر چک

کیا کروں چشم کی تعریف کہ وہ دونوں ترک ۔۔۔ بھڑ گئے توسنِ شوخی کی بہم باگ اچک

اُس کے ابرو سے تو تھی ہاتھ میں اِس کے شمشیر ۔۔۔ اِس کے ابرو سے رہی ہاتھ میں اُس کے برچھک

تیغ پہلے جھکی جس کی طرفِ ثانی پر ۔۔۔ کھا کے مژگاں کی تھپیڑ اُٹھ گئی الٹی ہی جھٹک

مصحف اس روئے کتابی سے کرے گر دعوا ۔۔۔ دیکھ کر صورتِ بینی کو رہے جی میں بھچک

حسن نے اس لیے بینی سے اٹھایا بیڑا ۔۔۔ کہ میں آفاق سے دل لے کے نہ چھوڑوں جی تک

تھا شکنجے میں تپاں حسن کے دل عاشق کا ۔۔۔ دونوں عارض میں جو دیکھے کوئی نتھنوں کی پھڑک

منحرین اُس کے وہ دو چشم کہ افراطِ حیا
پُشتِ پا سے نہ اٹھانے دے کبھی اُن کی پلک

بسکہ رکھتے تھے وہ باہم نظرِ شیشہ گداز
ساتھ شیشوں کے نہ دیکھی میں انھوں کی عینک

دونوں لب اُس کے تھے خجلت دہِ یاقوت و عقیق
سلکِ گوہر تھے وہ دندان و دہن جیوں دُرجک

مسیِ لب سے دہن پر یہ تبسّم کی بہار
جس طرح غنچۂ سوسن کھلے اندک اندک

سرنگوں چاہِ زنخداں کو جو اُس کے دیکھا (ق)
بعدِ صد غور یہ سمجھا میں کہ بے شبہہ و شک

پڑکے مرآتِ زنخداں میں کسی چاہ کا عکس
محوِ حیرت ہو، گیا راہ نکلنے کی بھٹک

گوش یوں زلف میں لگتے تھے، صدف کو جس طرح
لبِ دریا سے لگا دیتی ہو لہروں کی جھٹک

یوں چمکتا تھا پڑا اُس کے بناگوش کا دُر
اخترِ صبح جسے دیکھ کے رہ جائے بھچک

پنجۂ مہر نہ ہو سرخ شفق سے سرِ شام
سرخی دریوزہ نہ دے وہ کفِ رنگیں جب تک

رنگِ پاں یوں تھا نمودار گلے سے اُس کے
مے کی معلوم ہو جوں گردنِ مینا سے ڈلک

کیا کروں اس کی میں اب نازکیِ دل کا بیاں
بات کھڑکے تھا تو وہ خوف سے جاتی تھی جھجک

جس طرح زخمۂ مطرب سے ہلے بین کا تار

جسم کو سِلِ لمن الملک یہ مارا ہے دوال
مت سمجھ اس کے دو پستاں میں تو چھاتی ——

جب نظر اُس کے دو پستاں سے کمر تک پہنچی (ق)
اُس کی انگیا کو یہ سمجھا میں کہ بے شبہہ و شک

ٹوپیاں آنکھ پہ دے دی ہیں، وگرنہ یہ کمر
کرتی صیدِ دلِ عشّاق یہ چیتے کی لپک

سینۂ و پشت و پہلو میں یہ تھی شفّافی
جاوے آنکھیں ہیں، جنھیں دیکھ کے بجلی سی چمک

کینِ دل پہ مگر اس حسنِ جہاں سوز سے تھا
چار آئینہ سجے کام کا سالار یزک (؟)

ناف ایسی تھی کہ جوں چھپ کے کوئی غیرتِ حور
کھول پردے کو ذرا سا رہے ایک آنکھ سے تک

آگے کچھ بات ہے پردے کی جو چاہوں تو کہوں
پر حیا مجھ سے یہ کہتی ہے کہ بیہودہ نہ بک

ران اور ساق نے اُس کاسۂ زانو کے طفیل
ایک کاسے میں بہم حسن کی چکھی تھی چشک

کعبتیں اُس کے دو کعبین قدم مہرِ بساط
جیت لیں جو دلِ عاشق کو بتا کر چھلک

فندقِ پا میں یہ سُرخی تھی کہ زیرِ شمشاد
جس طرح بیر بہٹی رہے آتش سی دہک

بیخِ شمشاد کے ریشوں میں تو قمری نے کبھی
اشکِ گلرنگ سے دانے نہ پروئے یاں تک

دھج یہ دیکھ اُس کی جو دل ہونے لگا مجھ سے وداع
وقتِ رخصت میں کہا اُس کو کہ اللہ معک

پرسشِ نام جو کی میں نے تو وہ مایۂ ناز
متکلّم ہوئی یوں، مار کے مجھ پر چشمک

نام دولت ہے مرا، میں ہوں عزیزِ ہر دل
طرب و عیش ہے یاں اہلِ دول کو مجھ تک

ہوں دلآرام میں نوّاب محبّت خاں کی
بہرہ ور جس کی سخا سے ہے کہ و مہ ہر یک

یہ کہا مجھ سے مخاطب ہو کہ اے صاحبِ ہوش
شاعری مجھ کو ہے ہر نکتے سے تیرے مدرک

کر ذرا اس کی ستایش میں تو اظہارِ کمال
جب تلک ہو سکے ظاہر، تو نہ رکھ سینے میں ڈھک

مدح گستر ہو وہیں شوق سے سن میں نے یہ بات
پُر کیا گوہرِ معنی سے سخن کا درجک

دفعتہً ہو کے مخاطب بہ خیالِ ممدوح
شعر یہ دل کے سفینے سے میں لایا لب تک

تو وہ نوّابِ فلک جاہ ہے، در پہ جس کے
جبہہ سا عجز سے ہے روزِ نخستیں سے فلک

تیرے کف کو کہوں کف، یا صدفِ گوہر بخش
دل کو بھی دل کہوں، یا ثانیِ دریائے اٹک

(ق) تو وہ حاتم ہے زمانے کا کہ ہنگامِ سخا
لہر دل میں ترے آوے جو سخاوت کی تنک

لعلِ کوہ و دُرِ دریا، زر و سیمِ معدن
بخش اک پل میں کرے اہلِ خبر پر دستک

یعنی اب مجھ کو دفائن سے خبر دو تحقیق
تو میں کھدوا کے کروں وقفِ بزرگ و کوچک

(ق) ایک درہم کا کرے تجھ سے جو شخص آ کے سوال
شہر تنگ آئے زر و سیم سے اُس پر یاں تک

کہ کہے تجھ سے وہ، بس اب جو میں مانگوں تو قسم
تو یہ فرمائے کہ کچھ اور لے، بیہودہ نہ بک

نسبتِ ماسبق اتنا ہے ترے دور میں عدل
کہ رہے اہلِ ستم، دیکھ ستم کش کو، دبک

تاب کیا ہے جو قدم گاڑ کے یک جا ٹھہرے
آ پڑے کان میں ہاتھی کے جو پشّے کی بھنک

نہیں امکان جو بکری کے تئیں کھاوے شیر
شیر بکری جو ترے عہد میں کھیلیں کودک

شرع رائج ہے ترے دور میں یاں تک کہ مدام
ڈھول طبلوں کے لگے کھائے تھپیڑے ڈھولک

بُردباری تری لنگر دے، تو یہ مرکزِ خاک
یک بہ یک گاوِ زمیں پر گرے اِس طرح ڈلک

کہ بنے فیل کا دنداں وہیں اُس کی ہر شاخ
توڑ کر سر کو نکل آوے دہن سے ہر یک

اور جو کوہان ہے، سو.... وہ بنے اشتر کی
بیٹھ کر پشت میں، آوے تلے چھاتی کے لٹک

مہ کی غربال میں، لائق ہے کہ چھانیں گل کو
ڈالیں جس جا تمہے رہنے کو بنائے کوشک

عوضِ خشت ستاروں سے جڑیں سنگِ بلور
طشتِ خورشید میں بادل سے لگاویں آہک

رفعت اِتنی اُسے دیویں کہ نظر گردوں کی (ق)
پائے دیوار سے پہنچے جو لبِ بام تلک

تارک اُس کے سے گرے خاک پہ عمامۂ مہر
خطِ محور سے اگر باندھ نہ لے تحت حنک

صحن میں اُس کے ہو آراستہ وہ چار چمن
کہ جسے غیرتِ فردوس کہیں زیرِ فلک

شیشہ ہر غنچے کا پُر ہوئے گلرنگ سے واں
ساغرِ لالہ سے گرتی ہو مئے لعل بہ چھلک

برگ، صرصر کے جھکوروں سے سبھی دیتے ہوں تال
مرغ، مردنگ بجاتے ہوں ہر اک سمت پھڑک

بلبلیں نغمے سے رکھتی ہوں سبھی شغلِ سرود
گلبنیں، موجِ صبا سے رہیں لولی سی تھرک

صبحِ نوروز، ہر اک صبح کو واں کہ کے صبا
بیضے غنچوں کے لڑاتی رہے سر اور ...

تیرے دامن پہ اگر اُڑ کے پڑے ذرّۂ خاک
چرخ دے پنجۂ خورشید سے دامن کو جھٹک

فارسی شعر جو کہتا ہے تو، اُس کے آگے
ہے سخن اہلِ سخن کو سخنِ سعدی تک

ریختے میں جو تری طبع ہو ٹک نغمہ سرا
شعرِ سودا کے ملے کھنڈ سے دھوبی کے فلک

سیفی ہے سیف تری جانِ عدو کی خاطر
موٹھ جادو کی ہے موٹھ اُس کی بلا شبہ و شک

چڑھ گیا چرخ بلندی پہ اُسی کے ڈر سے
ہو گئی فرش زمیں، بن میں رہے کوہ دبک

تو کہیں وقتِ غضب ہاتھ میں تیرے آ کر
کاٹ کاڑھے نہ یہ خوں ریز سماتا بہ سمک

تیرے خیمے کی تو کیا ہو سکے مجھ سے تعریف
جس جگہ تیرے طویلے کی کھڑی ہو اسپک

بادریسہ نہ کریں شمس و قمر کو اُس میں
کہ بڑی چرخ سے ہے وہ، یہ نہایت کوچک

وصف میں اب ترے توسن کے پڑھوں اک مطلع
سن کے صرصر جسے، خجلت زدہ ہو جائے سرک

لیوے سبزے کی ذرا اپنے جو تو باگ اچک
جا کے بازی وہ ہوا میں کرے مثلِ سبزک

یوں چھپے اُس سے تو، جوں چاند کے حائل ہو چکور
جوں وہ تڑپے، وہیں تیری نظر آجائے جھ

حصر پہ لشکرِ اعدا کے کبھی ہو کے سوار
دے تو کاوا جو ذرا اُس کے تئیں باگ ا

سرعت اتنی وہ کرے حلقہ زنی میں کہ غبار
اُٹھ بگولے کی نمط، آنکھ لے ہر ایک کی

سمجھے اُس اسپ کو القصّہ یہی دیر کے بعد
آنکھ مل مل کے جو کھولے کوئی اُس میں سے ب

اژدہا ہے یہ کوئی، مار کے حلقہ جس نے
کہ برابر سر و دم بیچ میں لی گھیر کٹ

ٹک نظر اور اُٹھاوے تو کہے یوں جی میں
تیغِ عریاں کی تری دیکھ کے شانے پ

گرداب فوج کے کرتا ہے بیٹھی خورشید
دیکھیں کس کس کو جلائے، ہے یہ شعلے کی

پھر کرے تیغ زنی تو، تو وہیں اک دم میں
خاک و خوں بیچ تڑپھتی نظر آوے وہ

ایک حربے سے گریں گردمیں سو کاسۂ عمر
جس طرح چاک سے اُترے ہے پیاپے ص

آوے دشمن کا ترے کیوں نہ تباہی میں جہاز
ایسے گرداب میں جب آ کے پھنسے وہ

شوکت و شان جو ہاتھی کی ترے، کی میں خیال
دل سے آیا مرے فی الفور یہ مطلع لب

اُس کے ماتھے پہ غرض، کیا کہوں میں شانِ کجک
جس طرح ابرِ سیہ میں ہو نمودار دھنک

دانت اُس کے کوئی دیکھے جو دو سوے خرطوم
قدم اگلے مع گردن، وہ یہ سمجھے بے

جوشن و خود و زرہ، مونے سیہ تاب پہن
داستانوں کی دکھا ساعد و گردن پ

وقت کشتی کے، سکندر نے کسی زنگی کو
بھر کے کولی میں، لیا مرکزِ خاکی سے

یا خفا کنج سے ہو، شب کو کنھیّا نکلا
رادھکا نے لی ہے پیچھے سے کمر اس ک

ہے وہ برحق اِسی قابل، نہیں کچھ اس میں دروغ
کہ دہاں اس کے کو دے بوسہ جو مومن

صورۃً تو حجرِ اسود ہے وہ، اور دانت اس کے
دونوں بازو کے . . . ہیں بلاشبہہ و

حلقہ گر کر کے، وہ خرطوم کو لے دانتوں میں — اُس کے عاجین کو سمجھیں یہ بزرگ و کوچک

زہرہ باساعدِ سیمیں، کیے دو ہاتھ دراز — غرفۂ چرخ میں آئی ہے بجانے ڈھولک

پھر یکایک جو وہیں چشمِ تفکّر میری — پہنچی تا غارِ دہن، چھوڑ کے اُس کی مستک

دانت یوں بولے، کہ بہتی نہ سنی ہوویں گی — بیستوں سے کہیں دو شیر کی جوئیں اب تک

آکے جب باز میں، مستک وہ کرے اپنی بلند — اُس کے دانتوں پہ یوہیں جائے گمانِ زیرک

قلزمِ نیل میں یوسف نے لگا کر غوطہ — ہاتھ پانی سے نکالے ہیں مگر کہنی تک

ہو سوار اُس پہ تو اِس اوج کو پہنچے کہ مسیح — لا ترے ہاتھ دے آئینۂ خورشیدِ فلک

جب بٹھا کر تو اُسے، قصد اُترنے کا کرے — عرش اور فرش میں یوں شور کریں انس و ملک

چاہیں چرخ سے آ بامِ حرم پر عیسیٰ — نردباں مانگے ہے تا آوے اُتر صحن تلک

پخت و پز کا ترے مطبخ کی کروں کیا میں بیاں — جس میں موقوف نہ دن رات ہو دیگوں کی کھڑک

ماہ واں چاہے کہ میں قاب سپیدے کی بنوں — مہر کے جی میں کہ زردے کی میں واں ہوں صحنک

لاکھ من مائدہ واں ہو جائے — لون سانبھر کا ..... کھانے میں نمک

دیگ شوئی کو نہ پورا ہو کنووں کا پانی — کاٹ کر نہر جو واں لائیں نہ دریائے اٹک

نانِ نعمت کا نہ پھر نام لیں جو ہیں خوشخوار — تیرے مطبخ سے ملے اُن کو اگر اک جلبک

تیرے مدّاح کو بھی اب یہ توقّع ہے کہ روز — زلّۂ خوان سے پایا کرے اک قابِ خشک

میں تو سوتا تھا، پہ یہ خواب تصوّر ہے مجھے — جس کی میں پرسشِ تعبیر کو آیا یاں تک

بس بقا، کر تو دعائیہ پہ اب ختمِ کلام — آمیں، سن سن کے کہیں جس کے تئیں انس و ملک

نت خوشی بزم میں تیری رہے، اور در اوپر — ہو طرب حلقہ زن، اور عیش دے آکر دستک

تیرے ہر دوست کے، دولت رہے قدموں سے لگی
سرِ اعدا رہے سرچنگِ حوادث سے کلک

مئے معنی سے کر اب جامِ سخن کو سر شار ۔۔۔ دل میں ہے، تو ڑیے صہبائے خموشی کا خمار
یعنی اب مدحتِ نواب تقی خاں کیجے ۔۔۔ با مضامینِ تر و تازہ، بہ ضمنِ اشعار
چشمِ گردوں کے لیے، جس کی زمینِ در سے ۔۔۔ گرد باد آکے اٹھاتی ہے سدا ابھک کے غبار
اس کے ہاتھوں سے جو سائل کوئی ہنگامِ سخا ۔۔۔ سیم و زر لے کے، کرے صحنِ جہاں میں انبار
متحمل ۔۔۔ اس کی سمائی کا نہ ہو ۔۔۔ جوں خمِ خام بکس جائے سپہرِ دوّار
تیغ میں اس کی یہ برّش ہے کہ ہنگامِ غضب ۔۔۔ کمرِ چرخ پہ بیٹھے جو کرے اُس کا وار
اس طرح صاف نکل جائے اسے کر کے دو نیم ۔۔۔ برق کر جاوے ہے جس طرح کہ گنبد سے گزار
عدل میں بے بدل ایسا ہے کہ ہر سکیں سے ۔۔۔ خود ہیں آزار کش اب وہ، جو تھے مسکیں آزار
عدل کا اُس کے جو صعوہ ہے کوئی دست آموز ۔۔۔ اُڑ کے، جنگل میں وہ شہباز کو کرتا ہے شکار
اُس کا شبدیز تو خشکی پہ جہاں پیما ہے ۔۔۔ ق ۔۔۔ سطحِ دریا پہ بھی دوڑے جو وہ صرصر رفتار
یوں قدم تیز اُٹھاوے کہ ذرا پانی میں ۔۔۔ سُم، سوا نعل کے، تر ہونے نہ پاوے زنہار
فیل اُس کا یہ تناور ہے کہ بالائے زمیں ۔۔۔ اُٹھے ہے وار صفت، بیٹھے ہے مثلِ کہسار
دن کو دیکھ اُس کی سیاہی، مجھے آتا ہے عجب ۔۔۔ رہ گئی ہو کے گرہ کیونکے زمیں پر شبِ تار
دور میں اُس کے یہ ہے رُعبِ شریعت غالب ۔۔۔ نہیں ممکن کہ کرے نغمہ کشی ساز کا تار
مثلِ فصّاد، غرض ہاتھ سے ہر مطرب کے ۔۔۔ رنج میں نشترِ ناخن سے ہی رہتا ہے ستار
اس کے خیمے کی بزرگی کا کروں کیا میں بیاں ۔۔۔ طول اور عرض میں نو سارے جہاں کا ہے حصار
فرشِ مخمل پہ ہے استادہ بہ ایں شوکت و شان ۔۔۔ جس طرح باغ پہ .... ابرِ بہار
اُس کی اب خاصہ خوری کا ہے ۔۔۔ خانہ ۔۔۔ جس کے ہر خوان سے بدلا ہے فلک نے دستار
نانخورش کے ہے پیالوں پہ مہِ نو قرباں ۔۔۔ خوانچوں پر ہیں نمش کے مہ و خورشید نثار

چت کرے زمیں پہ جو دشمن کو لگا تیر بہ حلق
یوں رہے روبہ فلک اُس کی نمایاں سوفار

خون ...... جس طرح کسی طائر کا
باز کرتا ہے کوئی باز اُٹھا کر منقار

ندرِ ممدوح کی خاطر بضرورت میں نے
کہہ لیے بیٹھ کے اک دم میں یہ کتنے اشعار

کر بقا شعرِ دعائیہ پہ اب ختمِ کلام
تا کرے جا کے وہ ایوانِ اجابت میں گزار

جب تلک نام سخن کا ہے جہاں میں باقی
اور شہرت ہے سخن گو کی بہر شہر و دیار

وہ رہے ساتھ احبّا کے سدا م و شاد
دلِ اعدا کو رکھے خنجرِ اندوہ فگار

ل حضرتِ بقا سے کیا میں نے یہ سوال
کہیے کچھ ایسے شعر کہ ہوویں وہ حسبِ حال

لے جواب میں، کہ یہ منظور ہے، تو کر
آراستہ ہمارے لیے خلوتِ خیال

خادمانِ فکرِ سخن، اپنے پاس تک
ساقی کو بھی نہ ہووے گزرنے کی واں مجال

لکن وہ ہو جگہ، جو درِ دل کو کھولیے
آجائے واں بتوں کا نظر گلشنِ جمال

و شاخِ گل پہ نغمہ سرا عندلیبِ عیش
پر مارے واں نہ زاغِ غم و کرگسِ ملال

ں واں کے، دل کو صید کریں عندلیب وار
گر ایک سو بنفشہ و سنبل سے دھر کے جال

فِ بنفشہ کھول کے شانہ کرے نسیم
گوہر پروئے قطرۂ شبنم سے بال بال

ں غنچے سر بجیب ہوں، بیٹھیں ہیں جس طرح
گردن مراقبے میں جُھکا صاحبِ کمال

وں ادھ کھلی کلی سے گُل ایسے نمود، جوں
یوسف رہا ہوں روزنِ زنداں سے سر نکال

غ شعاع کھینچے جو سایے پر آفتاب
سورج مکھی ہو سامنے اُس کے پکڑ کے ڈھال

تی ہو اس قدر روشِ باغ کے قریب
تا گُل کی آبشار ہو آئینۂ جمال

رغانِ بوستاں سے جو رخصت بھی ہو بہار
چھوڑے چمن میں وہ گل و نسریں کو یرغمال

یسا اگر مقام ہو تو کیا مضایقہ
پل میں سخن کے گنج سے کر دوں تجھے نہال

ی میں نے عرض، قبلہ، یہ مشہور ہے مثل
راجہ کے گھر میں بھی ہے کہیں موتیوں کا کال

اضر ہے مختصر سا مرے دل کا یہ مقام
یہ ہے زیادہ اُس سے جو کی تم نے قیل و قال

بولے یہ مسکرا کے، کہ سب مشکلیں ہیں سہل
لیکن شکستِ خاطرِ احباب ہے محال

ممدوح سن ذرا کہ کوئی دم کی فکر میں
اُس دم نہ تیری مدح ہوئی اُن سے حسبِ حال

آئینہ تو جو ہاتھ میں لے اے نکو خصال
ہرگز پڑے نہ عکس، تو اتنا ہے بے مثال

مل کر ہوئی ہے تجھ مہِ کنعاں سے پھر جواں
دنیا اگرچہ مثلِ زلیخا تھی پیرِ زال

گو تیرے ساتھ گنجفۂ مکر روز و شب
ق
کھیلا کرے یہ چرخِ مشعبد ہزار سال

ہر چند اُس کنے ورقِ آفتاب ہے
پاتا ہے گا پر ترے ہاتھوں سے نت خلال

عادل تو اس قدر ہے کہ اب تیرے عصر میں
یکسر مزاجِ دہر نے پایا ہے اعتدال

ہے مدرسے میں جو کوئی معقول داں، سو اب
کرتے ہیں اُس سے جا کے سبھی لوگ یہ سوال

پانی پییں ہیں ایک جگہ اب تو گرگ و میش
پس کیونکے اجتماعِ نقیضین ہے محال

شرعِ نبی ہے یہ کچھ اب دور میں ترے
نیّت خلافِ شرع کرے کوئی، کیا مجال

طنبور جب یہ چاہے کہ نغمہ کروں بلند
فی الفور کھاوے ہاتھ سے مطرب کے گوشمال

مطلع پڑھوں اب ایک ستایش میں تیغ کی
دشمن کے جی کو جس کی فصاحت بنے وبال

چمکے اگر وغا میں تری تیغ جوں ہلال
پُرزے کرے کتاں کی طرح جسمِ بدسگال

آ کر غضب میں تو، کمرِ چرخ پر کبھی
مارے ذرا میان سے اُس کے تئیں نکال

سو ہے یقین مجھ کو کہ یوں اُس کو دو کرے
کاسہ اُتارے چاک سے جوں رشتہ، کلال

....
سمجھے ہے یوں کہ موت نے مارا ہے اُس پہ جال

وت یہ تجھ میں ہے کہ کوئی گرد تنگ دو (۹)
کشتی میں گر یہ چاہے کہ لے جاؤں تجھ کو ٹال

نگر تو دیوے اُس گھڑی ایسا کہ دفعتہً
گر جائیں پانو تیرے زمیں بیچ جوں جبال

رے زمیں پہ یوں کہ ہوں سب چور استخواں
اُچھلے پھر اُس کو تو جو پکڑ کر کمر دوال

بخشے سے بس کہ لعل و گہر بے حساب تو
اے حاتمِ زمانہ، تراسن کے یہ نوال

ریزگی کو کوہ نے دامن کیا دراز
باہر صدف نے ہاتھ دیے بحر سے نکال

لگتے نہیں زمیں پہ قدم تیرے پیل کے
اس طرح سے وہ پانو اُٹھاتا ہے....چال

س طرح غول باندھ زمیں سے ٹک اک بلند
کھولیں بہم کبوترِ وحشی ہوا میں بال

ٹھے، تو کوہ شکل ہے۔ پر اُٹھ کے جس گھڑی
بازی کناں خوشی میں کبھی وہ فلک مثال

طوم حلقہ کر کے جو دانتوں کے درمیاں
لیوے، تو اُن پہ ہوئے یہ ناظر کو احتمال

بدر چھپ گیا ہے سراپا خسوف میں
ہر دو طرف کُھلا ہے بہ مقدارِ دو ہلال

طلع لکھوں اب اک تمہرے مطبخ کے وصف میں
جو واں کی پخت و پز کی زیادت پہ ہووے دال

دوڑیں آب کش جو وہاں مشک اور پکھال
خالی ہر ایک چشمہ، تہی ہو ہر ایک تال

ی جگہ میں چاہیے گردوں بنے تنور
خورشید ہو رفیدہ، لگانے کو شیرمال

ست میں تیرے خیمے کی اب کیا کروں بیاں
بستی سے جس کے سامنے گردوں ہے ایک مال

عت میں کیا بیان کروں تیرے اسپ کی
آفت ہے اُس کی دوڑ، قیامت ہے اُس کی چال

سوار جب کہ تو اُس رہ نورد پر
دل بیچ لائے سیرِ مکانی کا گر خیال

نک اُس کو حدِ غرب سے میدانِ شرق تک
موڑے پھر اس طرف انھیں قدموں، تو وہ غزال

سم اپنے واں سے یہاں تک اک آن میں
کر دیوے رشکِ بدر، جو ہوں غیرتِ ہلال

س کو، عزمِ سیرِ زمانی جو کر کے تو
حدِ ازل سے سوئے ابد اُس کو دیوے ڈال

ہے یقین مجھ کو کہ طے کرلے آن میں
اس عرصۂ بعید کو وہ صاعقہ مثال

پلٹے جو پھر ابد سے، تو پہنچے ازل تلک　　اثنائے راہ میں سنہ ہجری سے کر وصا

پایا بیانِ مدح وثنا میں سخن نے طول　　لازم ہے اب دعا پہ کروں ختم یہ مقا

نت دوستوں کو تیرے رکھے چرخ شاد کام
اور دشمنوں کو تیرے کرے جلد پایمال

ہجویات

مثنوی در ہجوِ میر

اِن آنکھوں کا نت گریہ دستور تھا
دو آبہ جہاں میں یہ مشہور تھا

جو سیلابِ اشک ان سے اٹھتا تھا زور
تلاطم میں پڑتا تھا دریا سے شور

بنا میں نے ایک ریختے کا محل
لکھی در پہ اُس کے یہ ضرب المثل

وہاں آن کر میر کیا لے گیا
وہی تازہ مضموں چُرا لے گیا

عقب میں، چپ و راست پانی کا زور
کہاں جائے گا یہ دو آبے کا چور

اگر دائیں بائیں طرف یہ پھرا
کیا فرض دریا میں جا کر گرا

بھلا کون سی پا سکے گا یہ گھاٹ
نظر بھی تو آتا نہیں اس کا پاٹ

ادھر منتظر ہیں نہنگِ نظر
نگہ کے اُدھر سونس گاڑے ہیں سر

بچا ان بلاؤں سے یہ ذو فنون
تو پھر مردمِ آب ماریں گے کون

نہ منہ پھیرنے کی اسے تاب ہے
نہ کچھ آگے بڑھنے کا اسباب ہے

کہ راہِ گریز اس پہ سربستہ ہے
دو آبہ بھی آگے سے پیوستہ ہے

مگر پھیر کر منہ کرے مجھ پہ چوٹ
بنے سحر سے اژدہا لوٹ پوٹ

مجھے یاد ہیں اُس عزیمت کی قسم
کہ کہتے ہیں جن کو کلیدِ طلسم

نگاہیں ہیں دو چشم کی دو، ولیک
جہاں گھر سے باہر گئیں، یہ پھر ایک

نگاہوں کی پھر میں چلا کر کمند
پلک مارتے اس کو کرتا ہوں بند

کمندوں کے گر پھنس گیا تار میں
جنوں ہجو کے اس کو مینار میں

وہ مینار جب تک رہے برقرار
رہے میری سارق کشی یادگار

کہ پھر کوئی مضمون نہ سرقہ کرے
نہ غیرت، پرائے سخن پر دھرے

جو گزرے اودھر سے کوئی راہ گیر — کہے آ کے نزدیکِ مینارِ میر
یہ مینارِ دزدِ بد افعال ہے — جو چوری کرے، اُس کا یہ حال ہے
بقا جب یہ قصہ ہوا سب تمام
دھرا میں نے "مینارِ میر" اس کا نام

ہجو ایضاً

ہم نہ کہتے تھے تمہیں اے دوستاں — دوستی بندر کی ہے جی کا زیاں
کھائے اور گھر کے، جو ہو میموں سرشت — تا ابد جاوے نہ اُس کی خوے زشت
قصۂ اژدر رہا بالاے طاق — تازہ اک اشلک ہوئی ہے اتفاق
یعنی اس نے سن کے ہجو تازہ کی — پوچ گوئی اپنی بُرا آوازہ کی
میر ہے یا نطفۂ شیطاں ہے یہ — اس قدر جو درپے انساں ہے یہ
گو کہ پہلے شاعروں میں ہیکھنا — کر لگا اس کو تماشا دیکھنا (کذا)
گر بھڑایا جا ہو اپنی اپنی گند — اس کو جلدی سے کرو شیشے میں بند
ورنہ ہے یہ فکر میں ہر ایک کی — اپنی جا، کرلے گا انگلی نیک کی
کل پڑا تھا جا یہ اک شاعر کے سر — وو ہیں ہر کاروں نے مجھ کو دی خبر
اس کے جی کی لگ رہا تھا تاک میں — گر نہ جا دیتا میں دھونی ناک میں
میر کے جو ہمدم و ہم ذات ہیں — وہ بھی سب از عالمِ جنّات ہیں
گر کوئی ہوتا نقیب الشاعرین — یہ منادی پھیرتا میں ہر کہیں
بے طہارت رہیو مت اے مومنوں — جا بہ جا پھیلے ہیں بھتنے اِن دنوں
علم تسخیرات کا پکڑو سراغ — گھر میں لا رکھو کچھو چھے کا چراغ

اُٹھ کے کل میں مسجدِ جامع گیا
واں تماشا اور ہی دیکھا نیا

چاوڑی کی شہدیاں کھیلے ہیں ہیر
ہے زباں زد خلق کے آئے ہیں تیر

ایسے بھتنے سے جو تم نے چھیڑ کی
جوتیاں سلوا لو دو دو سیر کی

یاد آئی ہے مجھے اک طُرفہ نقل
جس کے سُننے سے پڑے حیرت میں عقل

آئے کل گھر میرے اک مخلص قدیم
دل غم و اندوہ سے اُن کا دو نیم

دم چڑھا، چھاتی دھڑکتی، چہرہ زرد
ہونٹھ سوکھے، چشم تر، گردے میں درد

آہ مُردم کہہ کے، اک کھائی پچھاڑ
مفت میں جی کو لگا تب میرے جھاڑ

جب ہوئی اُن کو افاقت بیش و کم
آئی کچھ اعضا میں طاقت بیش و کم

جا سے اُٹھ بیٹھے، ہوئے گرمِ سخن
سب کیے اپنے بیاں رنج و محن

کاے محبِّ صادق الاخلاصِ من
مخلصے از دوستانِ خاصِ من

کیتکی نامی، مری ہے اک کنیز
باسلیقہ، خوش ہنر، صاحب تمیز

اُس پہ اک بھتنا ہوا دل باختہ
رات کو آنے لگا بے ساختہ

اُٹھ کے جب وہ آسیا گرداں کرے
تب وہ ملعوں آ، اُسے حیراں کرے

دن بدن جھڑنے لگی وہ ماہ چہرہ
میں نے پوچھا ایک دن از روے مہر

جانِ من سچ کہہ تجھے کیا درد ہے
ایسا کیا غم ہے تجھے، کیوں زرد ہے

سرگذشتِ حال جب اُس نے کہی
مجھ میں کچھ طاقت نہ سُننے کی رہی

مصلحت دی میں کہ اے نیکو سرشت
گرم کر رکھ آج اک چولھے میں خشت

آج وہ آوے، تو تو مت کیجو شرم
بیٹھنے کو دیجو اُس کے خشتِ گرم

بیٹھ جاوے گا جو وہ اُس پر کبھو
پھر تماشا دیکھیو قدرت کا تو

مصلحت میری غرض آئی تھی راست
رہ گیا جب شب سے باقی ایک پاس

بیٹھ کر چکّی لگی وہ پیسنے
آہی گھیرا اُس کو اُس ابلیس نے

مصلحت میں نے جو دے رکھّی تھی کل ہو گیا سرزد وہی اُس سے عمل
خشت پر جا ہی وہ بیٹھا کود کے جل گئے دونوں سریں مردود کے
یک بہ یک اُس جا سے وہ بھاگا اچھل لب پہ جاری کی یہ بیتِ برمحل
واہ بی بی کیتکی، تم زور ہو اب[1] جو ادھر آئے گا نڈو چور ہو
تھا کمیں میں میں بھی بالائے پلنگ جا رہا اُس کے مقابل کر شلنگ
کر کے ریلا پیل میں جاں بازیاں کیں دھما دھم خوب مشت اندازیاں
لیکن اُس کی خوب لگتی تھیں چپات پر مرا روئی میں گھس جاتا تھا ہات
جب وہ میرے مارتا تھا تن کے مشت تکیے ہوتی تھی کئی جا گہ سے پشت
جی بچا کر میں نے لی راہِ گریز وہ بھی آیا میرے پیچھے تند و تیز
آپ تک پہنچا تو ہوں میں دوڑ دھوپ پر کھڑے ہوویں گے در پر آپ روپ
اُن سے جب یہ ماجرا میں نے سُنا جی ہی جی میں سوچ اپنا سر دُھنا
تلخ مجھ پر ہو گیا اُس وقت عیش گھر کے دروازے پہ آیا کھا کے طیش
دیکھتا کیا ہوں کہ میرا استادہ ہیں اُس کے سر چڑھنے پہ آمادہ ہیں
آپ پر پہلے پڑھا میں نے حصار پیچھے ٹالا ان کو تھّبر مار مار

کر بقا اس بات کا یاروں میں ذکر
تا کریں جلدی وہ اپنی فکر

میر نے تو ترا مضمون دو آبے کا لیا پر بقا تو یہ[2] دعا کر جو دعا دینی ہو
یا خدا، میر کے[3] دیدوں کو دو آبہ کر دے اور بلینی یہ بہا اُس کی کہ ترببنی ہو

---

[1] ن: پھر ادھر آوے تو۔ [2] ن، مج: یہ دعا دے۔ [3] ن: میر کی آنکھوں کو۔

ڈرتا ہوں گر گسوں کا نہ ہو میر ناشتہ
رنڈی کا سوکھ ساکھ بنا ہے گماشتہ

دیکھو تو کس طرح سے کھلاتا ہے مچھلیاں
صید افگناں رہے ہے بصیدِ گذاشتہ

دہقان تھا، تو شیخ سے سیّد یہ کیوں ہوا
توام زمیں میں گر نہ ہوا تخم کاشتہ

یکچند تا رہے ورقِ دہر پر بقا
کر ایسی ہجو آبِ طلا سے نگاشتہ

میر[ا] صاحب! پھر اس سے کیا بہتر
اس میں ہو وے جو نام شاعر کا

لے کے دیواں پکارتے پھریے
ہر گلی کوچے "کام شاعر کا"

یکچند میر جی نے ہم کو لگا کے لہرے
پھیکے کیے ہمارے جتنے تھے شعر گہرے

ہم کو یہ تھا بھروسا شاہوں کے ہیں یہ ...
چوروں کے پاسباں سے ہوتے ہیں .....

آخر کو میر اپنے مضموں کے دزد ٹھہرے
سنتے کہیں نہ ہو ویں، شیطاں کے کان بہرے

ہجو مرزا و میر

مرزا[۲] و میر باہم دونوں تھے نیم مُلّا
فنِّ سخن میں یعنی ہر ایک تھا ادھورا

اس واسطے بقا اب ہجوں کی ریسماں سے
دونوں کو باندھ باہم میں نے کیا ہے پورا

عیب[۳] ہے گرچہ کثرتِ یک لفظ
سخنِ فارسی سے تا ہندی

---

[۱] ن۔

[۲] ن: مرزا و میر دونوں باہم تھے نیم ملّا۔
بسکہ عالم میں دھوم ڈالی تھی
اے بقا ہم نے جب زیارت کی
ایک تو تو کہے ہے، اک ہی ہی

[۳] آ، مر: میر و مرزا کی شعر خوانی نے
کھول دیوان دونوں صاحب کے
کچھ نہ پایا سوائے اس کے سخن

ر جدا ہے تمام عالم سے — طورِ سودا و وضعِ میر تقی

نی واں لفظ "تو" ہے پُر کُنِ شعر — "ہی" سے ہے یاں کلام کی بھرتی

صول دیوان دونوں صاحب کے — اے بقا ہم نے جب زیارت کی

عر سودا و میر کے دیکھے — وہ تو "تو تو" کریں ہیں، یہ "ہی ہی"

سرایاں چوں کنم سر ریختہ — در جکِ پر در کنم در ریختہ دُر ریختہ

ے زر خواہ شعر ہیچو زر سنجان کجاست (کذا) — تا بگویم از زباں زر ریختہ زُر ریختہ

رسد شیرینیِ شعرِ مرا شعر عدو — من شکر افشاندم، او گر ریختہ گر ریختہ

عرِ تلخ تلخ گویان ہست ہیچو تلخہ تلخ — مرہ برمربیاں   مر ریختہ مُر ریختہ (کذا)

سخن طلبی، سوادِ شعرِ سودا را مخر — آخرش چوں می خری خر ریختہ خُر ریختہ

نکہ آن بی سود سودا سادہ لوحِ بیسواد — برامیدِ با ...... بر ریختہ بر ریختہ

ی خفیف العقل بہرِ خفت از بس در دو لفظ — طرح از عطفِ بیاں ار ریختہ اُر ریختہ

روانی میکند چوں میش در ہر گام صوت — ہیچو جرمِ موز ہا چر ریختہ چُر ریختہ

شعرِ پُر مضموں ہمی خواہد پر و بالِ بقا
سازدار ہر شاعرِ پر ریختہ بر ریختہ

ہجوِ دہقاں

ں پوچھا ایک دہقاں سے کہ بھائی — رسوئی آج تم نے کیا پکائی

ہم آج تو بھل جی جلاوا — پلی بھر تیل ڈگری کا منگاوا

مج : طرزِ سودا و طرزِ میر تقی۔

تنک لے اُہتے ہم بھتّی بگھاری　　　　تنک لے اُہتے بکنا چھونک داری
تنک لے اُہتے کانن میں چُواوا　　　　تنک لے اُہتے موچھن میں لگاوا
تنک لے اُہتے اُبٹن منہ کا کیتا　　　　تنک لے اُہتے بینی بیچ دیتا
تنک لے اُہتے دیوا گھر کا بالا　　　　تنک تنزی میں دل بیتا کی گھالا (کذا)
تنک مانجا تلتی میں پڑا ہے　　　　سوا کو کال کے بینی دھرا ہے (کذا)

مر— بھر دیں تو کل بھتی پکّی
بگھریے او چنا کی لے اکھسی (کذا)

ایک ملکی نے کہا قاضی سے، جب ہم نہ رہے
خاضی خصاقی ہی خصبے میں ترے ڈولیں گے
کی گرفت اُس نے جو خے پر، تو لگا یوں کہنے
قوب قاطر سے تری قاف ہی اب بولیں گے

فارسی کلام

یار باجور و جفا بوده سلامت باشد دلم از اهلِ وفا بوده سلامت باشد
بتِ خور چهره، گزو در تب و تابیم، بِرو سایهٔ حفظِ خدا بوده سلامت باشد
خلق در عهدِ لبت چون نتواند مردن با اجل عهده برآ بوده سلامت باشد
کامم آن لب بزمین داد، اکنون حاجت نیست عیسیٰ اکنون بشما بوده سلامت باشد
گمرهی پیر رهم گشت، اکنون حضرتِ خضر خلق را راهنما بوده سلامت باشد
آبِ تیغت که چه آبِ خضرم جان بخش ست بر سرم مرگ و قضا بوده سلامت باشد
گو که دجّال و شان غول خوانند، چه غم (کذا) مهدیم پیرِ هدا بوده سلامت باشد
ما بمردیم، لبت بهرِ رقیبان چون خضر چشمهٔ آبِ بقا بوده سلامت باشد
خضر راهم بنگه گشتهٔ خود ساز، که او در جهان تا بکجا بوده سلامت باشد
خود همکیدو نمکانید لبِ خود به بقا
مانی اکنون به بقا بوده سلامت باشد (کذا)

هر تیرِ غمزه ات زدلم، بر نشان رسید تیری که شد خطا ز دلِ من، بجان رسید
دیدیم بچهره یک دو سه اشکست پیش پیش تا غورِ چشمِ تر بکنم کاروان رسید
بر ذاتِ خود زخونِ دلم رزق تنگ بود اینک غمت بخانهٔ من میهمان رسید
تا دامن از دهانِ سگِ کوی ؛ د کشم حاجب بقصدِ جیب ازان آستان رسید
الفت نگر که آن سگِ کو بعدِ رحلتم بو کرده کرده تا بسرِ استخوان رسید
نا ورده تابِ ضبط، فغان جست چون سپند از مجمرِ درونِ من و در دهان رسید
معلوم جای ماهِ زمین سیرِ خود کنم دیگر اگر بود بفلک میتوان رسید
آوازِ پای اوست بقا آشنای گوش گر بشنوم ز دور، بگویم فلان رسید

تنافر از جاهل

شبی با بقا گفتم ای ناجوی جوانِ خردمند و پاکیزه خوی
ترا با چنین عقل و تدبیر و هوش چسان گفتهٔ نفس آید بگوش
همانا که او گفت، سازی قبول نداری سر موز حکمش عدول
باغوای ابلیسِ نادان فریب دلِ خویش تا کی نهی در نهیب
مشو در کفِ نفسِ جاهل اسیر اگر همچنین است، پیشین بمیر
ترا اژدها گر بود یارِ غار ازان به که جاهل بود غمگسار

مثنوی

مرو در پیِ عیب جویانِ خام ببر عیب پوشی ز آئینه وام
ازان مس بمس گردد و زر بزر که هم رنگ هرگز ندارد ضرر
چو معیوب بیند، شود عیب دار که از خود بگرداندش شرمسار
دگر بلهوس را بیفتد بدست نماید همان جلوه او را که هست
بروزش بود چهرهٔ دلفروز که بیند در و چهرهٔ خویش روز
شبانگاه گردد ازان تیره رو که شب روی خود را نبیند درو
ز زشتی نگویی گرت زشت گفت نکوهش ز نیکان بباید شگفت

ندانم بقا را ز آئینه کم
که روشن دل و سینه صافست هم

رباعی

تا دیده بود، زدست دیدن ندہم — با دیدِ تو جان زتن رمیدن ندہم
تا ہست ہر استخوانِ من حاملِ گوشت — من کارد باستخوان رسیدن ندہم

میخواست بقا شام وسحر از پیِ نام — کاغازِ کلام را رساند بتمام
بسیار بگفت وگفته انجام نیافت — بس کرد کلام ختم شد ختم کلام